

 Safar-e-Adab
BEING THE STRING OF YOUR KITE

www.safareadab.com

سفر ادب

ملائکہ احمد

خواب دیدہ



از قلم ملائکہ احمد

All Rights Reserved

Copyright: Malaika Ahmed (Author)

Published by: Safar-e-Adab

Published On: safareadab.com

To get published with us, contact us via email or website:

safareadab.com

safareadab@gmail.com

khanumaira@safareadab.com

adab@safareadab.com

Note: We don't charge anything to publish online. If anyone charges any kind of fee in order to publish your write-ups in the name of Safar-e-Adab, please don't try to go ahead with them and immediately report them using the contact us button on our website. Thank you

ضروری بات

خواب دیدہ کے تمام جملہ حقوق لکھاری "ملائکہ احمد" کے نام محفوظ ہیں۔ کہانی کا کوئی بھی حصہ کسی بھی صورت میں کسی دوسرے پلیٹ فارم یا سوشل میڈیا پر پوسٹ کرنے سے پہلے لکھاری کی اجازت درکار ہوگی۔ بغیر اجازت کہانی کا استعمال کرنے والوں پر سخت کارروائی کی جاسکتی ہے۔ اس کہانی اور اس میں موجود کردار محض تصوراتی ہیں۔ کسی بھی حقیقی کہانی یا انسان سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کسی بھی طرح کی مشابہت کو اتفاق سمجھا جائے۔



قسط نمبر: 01

باب اول: جلاوطن شہزادی

BEING THE STRING OF YOUR KITE

21 اکتوبر 2022

مجھے بچپن میں شہزادیوں کی کہانیاں سننا بہت پسند تھا۔ شاید اس لیے کہ شہزادیاں خوبصورت ہوتی تھیں۔ شاید اس لیے کہ وہ رحم دل ہوتی تھیں۔ شاید اس لیے کہ ان کی مدد کو شہزادے آیا کرتے تھے۔ یا شاید اس لیے کہ انکے لیے جادو ہوتے تھے۔ وجہ جو بھی تھی مجھے شہزادیاں بہت پسند تھیں۔ میں ان میں اپنا آپ دیکھا کرتی تھی۔ کیونکہ میں بھی ایک شہزادی تھی۔ لیکن پھر۔۔۔ پھر میں بڑی ہو گئی۔ اور میں نے جانا کہ شہزادیاں وہ نہیں ہوتیں جو بچپن میں مجھے دکھائی گئی تھیں۔

ڈیزنی نے ہمیں شہزادیوں کا بہت غلط کانسپٹ دیا ہے۔ راپنزل کی کہانی میری پسندیدہ تھی لیکن ایک عرصہ میں اس کے حقیقی معنی سمجھنے سے قاصر رہی۔ یہ سوال میرے ذہن میں بہت دیر سے آیا کہ جب راپنزل اپنے بال شہزادے کے لیے نیچے پھینک کر اسے اوپر بلا سکتی تھی تو وہ ان کے ذریعے خود نیچے کیوں نہیں جا سکتی تھی؟ بہت بعد میں یہ بات سمجھ آئی کہ راپنزل قید میں رہ رہ کر ذہنی غلامی کا شکار ہو چکی تھی۔ اس لیے اس کے لیے قید میں رہنا یا باہر رہنا ایک برابر تھا۔ باہر کی دنیا میں شہزادے کے علاوہ اسے کسی چیز میں دلچسپی نہیں تھی۔ اسی لیے اس نے کبھی خود کو قلعے سے باہر نکالنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ وہ ڈرپوک یا بزدل نہیں تھی وہ بس غلام تھی۔

اس نے اپنے بارے میں سوچنے کی بجائے ہمیشہ دوسروں کے بارے میں سوچا۔ کبھی اپنے لیے جینا نہیں سیکھا۔ پہلے وہ جادو گرئی کے لیے جیتی رہی اور پھر۔۔۔ پھر اس کے دل میں شہزادے کے لیے جینے کی امنگ پیدا ہوئی۔ اس سب میں راپنزل ”خود“ کہاں تھی؟ کہیں بھی نہیں۔ لیکن اس میں اس کا قصور نہیں ہے۔ میں نے کہا نا وہ بس غلام تھی اور اپنی غلامی سے لاعلم بھی تھی۔ میں بھی ایک عرصہ لاعلم رہی۔

لیکن پھر میں نے جانا یہ لاعلمی شہزادیوں کے لیے خوش آئند ہوتی ہے۔ غلامی کے بدلے جب دنیا جہان کی نعمت آپ کے قدموں میں رکھ دی جائے تو کسے علم ہوتا ہے کہ وہ غلام ہے؟ آپ کے ایک اشارے پہ دنیا ڈھیر کر دی جائے، شہزادے آپ کے لیے آنے لگیں، جادو ہونے لگیں تو کسے یہ غلامی بری لگتی ہے؟ مجھے بھی کبھی نہیں لگی۔ دنیا جنت لگتی ہے۔ غلامی کے بارے میں کون سوچتا ہے؟ میں نے بھی کبھی نہیں سوچا۔

پھر ایک وقت آیا جب میں نے جانا شہزادیاں صرف غلام نہیں ہوتیں وہ اداس بھی ہوتی ہیں۔ اصل دنیا کی شہزادیوں میں اور ڈیزنی کی شہزادیوں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اصل دنیا کی شہزادیاں ایک وقت بعد اپنی غلامی کے بارے میں جان جاتی ہیں۔ میں نے کہانا ڈیزنی نے ہمیں شہزادیوں کا غلط کانسیپٹ دیا ہے۔

قدیم چینی اور جاپانی شہزادیاں اپنی آپ بیتی لکھا کرتی تھیں۔ وہ اپنی ڈائریوں میں لکھتی ہیں کہ انہوں نے بے حد اداس زندگی گزاری۔ دنیا جہان کی نعمت ایک اشارے پہ ان کے قدموں میں ڈھیر کر دی جاتی تھی مگر ان کے پاس آزادی نہیں تھی۔ وہ دن کی روشنی میں محلوں سے باہر نہیں جاسکتی تھیں۔ کسی غیر مرد کی نگاہ ان پہ پڑ جانا ان کی سب سے بڑی غلطی سمجھا جاتا تھا۔ وہ چہل قدمی کے لیے اپنی کنیزوں اور محافظوں کے دستے کے ساتھ رات کے وقت جایا کرتی تھیں۔ اور لائٹن کی روشنی جہاں تک جاتی وہاں تک انھیں دیکھنے کی اجازت ہوا کرتی تھی۔ انھیں محل سے باہر رہنے والے عام لوگوں پہ رشک آتا تھا کیونکہ وہ جہاں چاہتے جاسکتے تھے، جو چاہے کر سکتے تھے۔ مگر شہزادیوں کو اس سب کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ ان کے لیے شہزادی ہونا عذاب بنا دیا گیا تھا۔ کیونکہ شہزادی ہونا صرف قید نہیں تھا یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری بھی تھی۔ ایک بہت بڑا بوجھ تھا۔ اور سب سے بڑھ کر ایک ان چاہا بوجھ۔ اسی لیے شہزادیاں اداس ہوتی تھیں اور ان کے دل بوجھل۔ یہ چیز انھیں اندر سے مردہ کر دیتی تھی۔ اور کسی حد تک سفاک، خود غرض اور سنگ دل بھی۔

لیکن یہ سب یہاں ختم نہیں ہوتا تھا۔ قدیم زمانے میں شہزادیوں کو سیاسی مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ ان کے لیے شہزادے نہیں آتے تھے۔ جادو نہیں ہوتے تھے۔ ان کے سودے ہوتے تھے۔ محبت پر ان کا کوئی حق نہیں تھا۔ اپنے لیے فیصلے کا اختیار انھیں کبھی نہیں ملتا تھا۔ انھیں اس چیز کی تربیت دی جاتی تھی کہ کچھ بھی ہو جائے انھیں ہر حال میں اپنے باپ سے وفاداری کرنی ہے۔ اس لیے شہزادیاں اپنے شوہروں کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے ہر ترکیب آزمایا کرتی تھیں تاکہ انھیں یقین دلا سکیں کہ وہ ان کے ساتھ وفادار ہیں لیکن درحقیقت وہ ان کے ساتھ وفادار نہیں ہوا کرتی تھیں۔ ان کے دل مردہ ہوتے تھے اور وہ قید سے رہائی چاہتی تھیں کیونکہ ساری زندگی وہ قید میں رہ رہ کر تھک چکی ہوتی تھیں۔ شہزادیاں ”خود“ اپنے لیے کبھی کچھ نہیں کر سکیں۔ انھیں ہمیشہ ”استعمال“ کیا گیا۔ اور جس نے ”اپنے“ لیے کوشش کی اس سے ”جینے“ کا حق چھین لیا گیا۔

ڈیزنی نے ہمیں شہزادیوں کے بارے میں کچھ بتایا اور تاریخ ہمیں کچھ اور بتاتی ہے۔ لیکن۔۔۔۔۔ کبھی کسی نے ہمیں یہ نہیں بتایا کہ جلاوطن شہزادیاں کیسی ہوتی ہیں؟

سر سے آسمان چھن جائے۔ پیروں کے نیچے کی زمین غائب ہو جائے۔ دنگا فساد مچ جائے۔ ہر طرف سے غداری کی بو آنے لگے۔ دھوکا فریب فضا میں شامل ہو جائے۔ گھٹن ہر لمحے کے ساتھ بڑھتی جائے۔ سانس رکنے لگے۔ محل کے دروازے آپ پر بند کر دیئے جائیں۔ دربدی آپ کا مقدر لکھ دی جائے تو ایسی صورت حال میں شہزادی کیا کرے؟

ڈیزنی کی شہزادی ہو یا تاریخ کی شہزادی۔۔۔ سب نے مجھے ایک بات ضرور بتائی کہ شہزادیوں کو اور کچھ آتا ہو یا نہ آتا ہو انھیں یہ ضرور پتا ہوتا ہے کہ انھیں ہر حال میں ”سروائیو“ کرنا ہے۔ کیونکہ انھیں ہمیشہ یہ بتایا گیا ہوتا ہے کہ ان کا زندہ رہنا ”ضروری“ ہے۔ بھلے وہ غلامی کی زندگی گزارتی رہی ہوں۔ بھلے وہ

استعمال ہوتی رہی ہوں۔ لیکن یہ طے ہے کہ انھیں زندہ رہنا ہے۔ اس لیے جب شہزادیاں جلاوطنی کا طتی ہیں تو انھیں پتا ہوتا ہے کہ انھیں ”سروائیو“ کیسے کرنا ہے۔ کیا آپ کو پتا ہے کہ جب شہزادیاں سروائیو مل موڈ پر آ جاتی ہیں تو ان سے زیادہ خطرناک اور کوئی نہیں ہوتا؟

جلاوطنی ایک طرح سے شہزادیوں کے لیے آزادی کی ضمانت ہوتی ہے۔ لیکن۔۔۔۔۔ جو ان سے چھینا گیا ہوتا ہے اس کا غم اتنا گہرا ہوتا ہے کہ ان کے اندر انتقام سراٹھانے لگتا ہے۔ یہ آزادی ان کے لیے آزادی نہیں رہتی۔ جنگ کی شکل اختیار کرنے لگتی ہے۔ پھر شہزادیاں خود کو ایک ہتھیار کی طرح تراشتی ہیں۔ جلاوطنی کاٹتے ہوئے زندہ رہنے کے لیے ہر جنگ لڑتی ہیں۔ اپنے ہر خوف کو ختم کرتی ہیں اور یوں ایک بلا بن کر ابھرتی ہیں۔ ان شہزادیوں کو کسی چیز کا کوئی ڈر کوئی خوف نہیں رہتا کیونکہ وہ خود خوف کی علامت بن چکی ہوتی ہیں۔ پھر ان جلاوطن شہزادیوں سے خطرناک انسان اور کوئی نہیں ہوتا۔

آپ جاننا چاہتے ہیں میں کون ہوں؟

میں بھی ایک جلاوطن شہزادی ہوں۔ ایک عرصہ غلام رہی ہوں۔ لیکن اب بلا آخر آزاد ہوں۔ اس جلاوطنی نے مجھے آزادی کے صحیح معنی سے روشناس کروایا ہے اس لیے میں اپنی آزادی کی قدر کرتی ہوں۔ میں انتقام کے لیے تیار ہوں۔ میں نے خود کو ایک تیز دھار ہتھیار کی مانند تراشا ہے۔ میں ہر جنگ کے لیے تیار ہوں۔ میں خوف کی علامت ہوں اور خطرناک بن چکی ہوں۔ جو مجھ سے چھینا گیا ہے میں وہ واپس لینے کے لیے پوری طرح سے تیار ہوں۔ دنیا کو چاہیے کہ وہ ایک جلاوطن شہزادی کے قہر سے پناہ مانگے۔ میں اپنا تخت کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑوں گی۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ اب کی بار میں غلامی قبول نہیں کروں گی کیونکہ میں ایک جلاوطن شہزادی ہوں اور آزادی کے اصل معنی سے روشناس ہوں۔ اب میں دنیا کو بتاؤں گی کہ اصل میں ایک شہزادی کیسی ہوتی ہے۔

میں۔۔۔

شہزادی ہوں۔۔۔

فقط ایک جلاوطن شہزادی۔۔۔

☆☆☆☆☆

موجودہ وقت: اکتوبر 2024

گھور اندھیری رات۔۔۔ تخبستہ ہوائیں۔۔۔ ہو کا عالم۔۔۔ گہرا اندھیرا۔۔۔ آسمان پہ تیرتے کالے
بادل۔۔۔ بادلوں کی اوٹ میں چھپتا چاند۔۔۔ ویران جنگل۔۔۔ گھنے اونچے لمبے درخت۔۔۔ جھینگروں کی
آوازیں۔۔۔ سرسراہٹ پیدا کرتی ہوا۔۔۔

اس گھور اندھیرے میں ایک لڑکی محتاط انداز میں چلتی دکھائی دے رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا بدن سے ٹکراتی
تو کپکپی سی طاری ہو جاتی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اس نے ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ اندھیرے کے باعث کچھ خاص
دکھائی نہ پڑ سکا کیونکہ چاند اس وقت بادلوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ مگر اتنا معلوم ہو چلا تھا کہ وہ کسی ایسی جگہ
موجود ہے جہاں ہر طرف درخت ہی درخت ہیں۔ وہ کافی دیر سے چل رہی تھی۔ اب تو چل چل کر ٹانگیں
بھی شل ہونے لگی تھیں۔ اس نے قریب موجود درخت پہ ہاتھ رکھا اور ذرا دیر کو رک کر گہرے گہرے
سانس لینے لگی۔ دفعتاً درختوں میں سرسراہٹ سی پیدا ہوئی۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا اور آواز کی سمت
دیکھنے لگی۔

چاروں اور سبزہ ہی سبزہ تھا۔ دور دور تک ہرے بھرے میدان پھیلے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی
تھی۔ چاروں اور پھیلے اس میدان میں جگہ جگہ درخت لگے تھے اور اس میدان کے ارد گرد سبزے سے

ڈھکی پہاڑیاں تھیں۔ وہ ارد گرد نگاہ دوڑاتا آگے بڑھ رہا تھا کہ دفعتاً ایک جگہ ٹھہر گیا۔ سامنے کا منظر اس قدر دلفریب تھا کہ وہ مبہوت سا اسے دیکھے گیا۔ ڈھلوان کی طرف جاتے ہوئے سامنے جھیل تھی۔ جھیل کا پانی سبز تھا۔ اب یہ قدرتی سبز تھا یا ارد گرد موجود پہاڑوں کی کائی کا عکس تھا یہ قریب جا کر ہی معلوم ہو سکتا تھا۔ پانی کی صاف شفاف سطح پہ سورج کی چمکتی کرنیں سنہری افشاں کی طرح بکھری تھیں۔ منظر واقعی دلفریب تھا۔ لیکن یہ قدرت کا خوبصورت نظارہ نہیں تھا جس نے اسے مبہوت کیا تھا۔ یہ وہ تھی جو سفید لباس میں جھیل کنارے بیٹھی اس منظر کو مکمل کر رہی تھی۔ وہ کئی لمحے اسے دیکھتا رہا پھر خوشگوار سی حیرت لیے آگے بڑھنے لگا۔ جھیل کنارے بیٹھی لڑکی نے کسی احساس کے تحت سر اٹھا کر دائیں جانب دیکھا۔

آواز ہر گزرتے لمحے کے ساتھ قریب آتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی تیز تیز قدم لیتا جھاڑیوں کو روندتا اسی سمت آرہا ہو۔ لڑکی نے گھبرا کر ایک بار پھر چلنا شروع کر دیا۔ خوف کی ایک لہر اس کے پورے بدن میں سرایت کر گئی۔ اس ٹھنڈ میں بھی اسے پسینہ آنے لگا تھا۔ وہ مزید تیز قدموں سے چلنے لگی۔ مگر چلنا مشکل ہو تا جا رہا تھا۔ اسے نہیں پتا تھا وہ کہاں تھی، نہ ہی یہ پتا تھا کہ یہاں سے نکلنے کا راستہ کس طرف تھا۔ اندھیرے میں اندازے سے سمت کا تعین کرتے وہ بس چلتی چلی جا رہی تھی۔ درخت لمبے اونچے اور گھنے تھے۔ اوپر جا کر گھنی شاخیں آپس میں ملتیں ایک چھت سا بنا رہی تھیں۔ ذرا دیر کو اگر جو چاند باہر آتا بھی تو بھی کچھ دیکھ پانا ناممکن تھا۔ وہ چند لمحے سانس لینے کو ایک بار پھر رکی دفعتاً اسے احساس ہوا آواز اب پیچھے کی بجائے سامنے کی طرف سے آرہی تھی۔ اسے سمجھ نہ آیا اب وہ کیا کرے، کس طرف جائے۔ ایک بار پھر ارد گرد نگاہ دوڑائی کہ شاید کچھ سمجھ آجائے مگر بے سود۔ تھک ہار کر اب کی بار اس نے دائیں طرف چلنا شروع کر دیا۔ تھوڑا آگے آنے پر اسے احساس ہوا کہ اس طرف کی زمین کیچڑزدہ تھی اور گھاس اتنی

چاند اسی لمحے بادلوں کے پیچھے سے نکل کر سامنے آیا۔ لڑکی نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہ جس جگہ موجود تھی وہاں درختوں کی شاخیں اوپر سے اتنی گھنی نہیں تھیں اس لیے چاند کی ہلکی ہلکی سی روشنی سفر کرتی

یہاں تک با آسانی پہنچ رہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر ایک بار پھر اپنے تعاقب کار کی جانب دیکھا۔ اس کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا اور ہڈ سر پہ قدرے آگے تک گرا اس کے چہرے کو پوری طرح چھائے ہوئے تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اب آہستہ آہستہ چلتا اس کے قریب آ رہا تھا۔ وہ خوف سے اپنی جگہ جمی کھڑی رہی۔ چاند کی روشنی نے گویا اس پہ کوئی منتر سا پھونک دیا تھا کہ وہ ہلنے تک سے قاصر تھی۔ خوفزدہ نگاہوں سے وہ اسے اپنی طرف آتا دیکھتی رہی یوں جیسے جان گئی ہو کہ اب بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تبھی اس کی نگاہ اس کے دائیں ہاتھ میں پکڑے خنجر پہ پڑی۔ تعاقب کار نے بھی شاید اس کی نگاہوں کا مرکز جان لیا تھا۔ اس لیے سر جھکا کر اپنے ہاتھ میں موجود خنجر کو دیکھا پھر اسے دیکھ کر مسکرایا۔ وہ سنہرے رنگ کا تھا۔ لڑکی اس خنجر کو پہچانتی تھی۔

وہ پلکیں جھپکے بغیر لڑکی کے مسکراتے چہرے کو دیکھتا رہا۔ لڑکی بھی گردن موڑے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے نظروں کے حصار میں رکھے ایک بار پھر چلنا شروع ہوا۔ لڑکی وہیں کھڑی رہی۔ جب اسے لگا کہ ان کے درمیان فاصلہ کم ہونا شروع ہوا ہے تو اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔ لڑکی اسے یوں اپنی طرف بھاگ کر آتا دیکھ کر کھکھلا کر ہنس دی۔ لڑکے کے چہرے پہ ایک بار پھر خوشگوار سی مسکراہٹ در آئی۔ اسے بھاگتے دیکھ کر لڑکی نے بھی بھاگنا شروع کر دیا۔ جھیل کا پانی، آس پاس بکھرے درخت، سرسبز میدان، سر پہ چمکتا سورج، ٹھنڈی ہوا، سب دلچسپی سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ لڑکی کی کھکھلاہٹ اور لڑکے کی بے قراری ان سے مخفی نہ تھی۔ سب ان کی اس آنکھ مچولی سے محفوظ ہو رہے تھے۔

”لانگ ٹائم لٹل گرل۔“ لڑکی کے سامنے رک کر اس نے محفوظ کن انداز میں کہا۔ لڑکی کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ اس آواز کو پہچانتی تھی۔ وہ اس آواز کو لاکھوں کے مجمعے میں بھی پہچان سکتی تھی۔ حیرت، دکھ، تکلیف، صدمہ وہ بیک وقت کئی کیفیات کا شکار ہوئی۔ سامنے کھڑا شخص کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ اگلے کئی لمحے بولتا رہا۔

اسے کچھ بتاتا رہا۔ قہقہے لگا کر ہنستا رہا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔ وہ کیا کہہ رہا تھا اسے سمجھ نہیں آرہی تھی۔ چاند کی روشنی ابھی تک ان دونوں پہ پڑ رہی تھی۔ دور کہیں سے جھینگروں کی آوازیں بھی آتی سنائی دے رہی تھیں۔ سامنے موجود شخص اب کہ خاموش ہوا اور کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر گھوم کر اس کے پیچھے کھڑا ہوا اور سنہرا خنجر اس کی گردن پہ رکھا۔

”ٹائم فار آگڈ بائے گرل۔“ وہ اس کے کان کے پاس جھک کر بولا۔

لڑکی کے بھاگنے نے ایک بار پھر ان کے درمیان فاصلے کو مزید بڑھا دیا تھا۔ لیکن لڑکا اب کی بار نہیں رکا۔ وہ ویسے ہی بھاگتا رہا۔ لڑکی اس سے کافی آگے جا چکی تھی اور وہاں جا کر ایک بار پھر رک گئی تھی۔ لڑکا اگلی کتنی ہی دیر بھاگتا رہا۔ اس کا سانس بری طرح پھول چکا تھا۔ چہرہ پسینے سے تر تھا۔ اس خوشگوار موسم میں بھی اسے گرمی لگنے لگی تھی۔ جب وہ بھاگ بھاگ کر تھک گیا تو بلا آخر رک گیا۔ اگلے کئی لمحے وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے جھک کر گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔ لڑکی نے ایک بار پھر مسکراتے ہوئے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔

خنجر کا تیز دھار پھل اپنی گردن پہ محسوس کرتے اس کے شل اعصاب یک دم بیدار ہوئے۔ اندر دبا چھپا غصہ عود کر سامنے آیا۔ خوف کہیں بھاگ کھڑا ہوا۔ دکھ، تکلیف، صدمہ کہیں دور جا سویا۔ غصہ ہر جذبے پہ غالب آگیا۔ اس کے بدن میں گویا شرارے سے پھوٹ پڑے تھے۔ اگلے چند لمحوں میں کیا ہوا وہ نہیں جانتی تھی لیکن خنجر اب اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس خنجر کو پہچانتی تھی۔ یہ اس کا خنجر تھا۔ وہ بڑی مہارت سے اسے اپنی انگلیوں پہ گھما رہی تھی۔ سامنے موجود شخص کے چہرے پہ اس سارے وقت میں پہلی بار خوف کے سائے لہرائے۔ لیکن اسے پتا تھا بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ یہ کھیل اس نے ترتیب دیا تھا، بھاگنے کا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ یہ آمنے سامنے کھڑے ہو کر وار کرنے کا وقت تھا۔ لڑکی کا چہرہ سپاٹ تھا۔

کچھ دیر پہلے کا خوف کہیں غائب ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پہ ڈھونڈنے سے بھی خوف کا شائبہ تک نہ دکھتا تھا۔ اور آنکھیں۔۔۔ وہ سرد تھیں اور بیک وقت۔۔۔ بے رحم بھی۔

”پلیز رک جاؤ۔“ لڑکے کا انداز منت بھرا تھا۔

اس کی بات سن کر لڑکی ایک بار پھر کھکھلا کر ہنس دی۔ ہوانے اپنی رفتار دھیمی کر لی۔ سورج نے اپنی چمک ذرا دم ہم کر دی۔ جھیل کے پانی نے اپنا شور ذرا کم کیا۔ درختوں اور میدان کی ہریالی نے اپنا دم سادھ لیا۔ سب لڑکی کے جواب کے منتظر سے اسے دیکھے گئے۔

لڑکی نے اسی طرح ہستے ہستے سر اثبات میں ہلا دیا۔ خوشی سے سارا عالم جھوم اٹھا۔ لڑکا قدرے بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا۔ اسے اس کے اتنی آسانی سے مان جانے کا ہرگز یقین نہیں تھا۔ سرشاری کے عالم میں وہ دھیمے دھیمے قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھنے لگا۔ چہرے پہ پرسکون سی مسکراہٹ تھی۔ بلا آخر فاصلے ختم ہونے کو تھے۔ سنہرے بالوں اور چمکتی آنکھوں والی لڑکی چہرے پہ مسکراہٹ سجائے اسے اپنی طرف آتا دیکھتی رہی۔ ان کے درمیان بس چند قدموں کا فاصلہ تھا۔ اتنا کم کہ لڑکی اپنے چہرے کا عکس اس کی آنکھوں میں دیکھ سکتی تھی۔ لیکن پھر۔۔۔

”اٹس ریلی ٹائم فار آگڈ بائے ڈیر۔“ الفاظ ہڈیوں کو جمادینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اس نے سامنے والے کے بولنے کا انتظار نہیں کیا۔ مرنے اور مارنے میں سے ہمیشہ اس نے مارنے کا انتخاب کیا تھا۔ موت کا خوف فطری تھا لیکن اگر اسے پتا ہوتا کہ سامنے یہ شخص ہونے والا تھا تو وہ اپنے خوف کو کبھی اس پہ عیاں نہ کرتی۔ ایک لمحہ بھی مزید ضائع کیے بغیر اس نے خنجر سامنے والے کی گردن پہ پھیر دیا۔ خون کے چھینٹے اڑ کر اس کے چہرے پہ پڑے۔ مقابل چند لمحے صدمے میں گھرا کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر لڑکھڑا کر نیچے بیٹھتا چلا

گیا۔ اس کی گردن سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔ وہ اوندھے منہ کیچڑزدہ زمین پہ گر پڑا۔ چند لمحوں بعد اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ لڑکی نے ایک نگاہ بھی اس پہ ڈالنا گوارا نہ کیا اور خون آلود خنجر مضبوطی سے ہاتھ میں تھامے آگے بڑھ گئی۔

اس سے پہلے کے فاصلہ مکمل طور پہ ختم ہوتا اور وہ اس کے سامنے آکر ٹھہر جاتا۔ لڑکی ایک بار پھر ہلکھلا کر ہنس دی۔ اب کی بار لڑکے کو اس کے ہنسنے کی وجہ سمجھ نہ آئی۔ وہ نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھتا محتاط انداز میں چند قدم کا فاصلہ عبور کرنے لگا۔ مگر۔۔۔۔۔ لڑکی اسے دیکھ کر ہنستے، سر نفی میں ہلاتے اس کی نظروں کے سامنے غائب ہو گئی۔

”نہیں۔۔۔ رکو۔۔۔“ لڑکا متوحش سے انداز میں چلایا۔ سارے عالم نے افسردگی کی چادر اوڑھ لی۔ وہ گھٹنوں کے بل گرنے کے سے انداز میں بیٹھتا چلا گیا۔

ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی۔

ایک جھٹکے سے اس کی آنکھ کھلی۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

☆☆☆☆☆

امریکی ریاست کیلیفورنیا کا شہر لاس اینجلس۔۔۔ بلند و بالا خوبصورت عمارات سے بھرا شہر۔۔۔ انھیں عمارات میں سے ایک عمارت کے اندر کا منظر۔۔۔

سفید ٹائلز اور اعلیٰ انٹیریئر سے مزین یہ عمارت دکھنے میں بے حد خوبصورت لگتی تھی۔ راہداری میں قدم قدم چلتے آگے بڑھتے تو دائیں طرف بڑا سا ہال تھا جو اس وقت لوگوں سے کچا کچھ بھرا ہوا تھا۔

”سر آپ کو کیا لگتا ہے اس سال فوربز کی اینول لسٹ میں آپ کا نام ہو گا؟“ پہلی قطار میں موجود کسی رپورٹر نے سامنے اسٹیج پہ بیٹھے شخص سے سوال کیا۔ اسٹیج پہ بیٹھا شخص آنکھیں چھوٹی کیے بغور رپورٹر کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا سوال سن کر مسکرایا۔ مسکراتے ہوئے اس کی آنکھیں چھوٹی ہو جایا کرتی تھیں اور آنکھوں کے گرد جھریاں واضح ہو جاتی تھیں۔

”دی اکانومسٹ کے پچھلے ہفتے کے کورپہ آپ ہیں اور اس میں آپ کے بارے میں ایک تفصیلی آرٹیکل بھی آیا ہے۔ آپ اپنی ان کامیابیوں کے بارے میں کیا کہنا چاہیں گے۔“ ایک دوسرے رپورٹر کا سوال ابھرا۔ (فوربز اور دی اکانومسٹ امریکا کے مشہور میگزینز ہیں)

”دیکھیں۔۔۔ میں، میری کامیابی، میرا نام کس لسٹ، کس میگزین میں آ رہا ہے یہ حساب رکھنا میں نے چھوڑ دیا ہے۔ آج کی اس تقریب کا مقصد مجھے ڈسکس کرنا نہیں ہے۔ آج کی اس تقریب کا مقصد ہمارے فلسطینی بہن بھائیوں کے لیے امداد اکٹھی کرنا ہے۔“ نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا تو رپورٹرز بھی جواباً مسکرا دیئے۔ ہال میں موجود ہر شخص پوری توجہ سے اسے سن رہا تھا۔ اس کی اس بات پہ کئی لوگوں کے چہروں پہ مسکراہٹ بکھری۔ پچاس اور پچپن کے درمیانی عمر کا وہ شخص اپنی فٹنس کی وجہ سے اپنی عمر سے کئی سال چھوٹا دکھتا تھا۔ کنیٹیوں کے نزدیک چند سفید بال نظر آتے تھے ورنہ وہ دکھنے میں چالیس پینتالیس سال کا لگتا تھا۔

”غزہ پہ ہونے والے مظالم کو ایک سال ہو چکا ہے۔ ہم ان لوگوں کے لیے ابھی تک کچھ بھی نہیں کر پائے۔ اور بد قسمتی سے اس میں ہماری اپنی ہی حکومت شامل ہے۔“ اس بات پہ ہال میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ یہ بات کہنے کی ہمت اوریوں میڈیا کے سامنے کہنے کی ہمت ہر کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا وہ کیا کہہ رہا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا وہ کیوں کہہ رہا تھا۔ اس کے سامنے بیٹھے رپورٹرز پبلک اور پرائیویٹ

میڈیا دونوں سے تعلق رکھتے تھے (پبلک اور پرائیویٹ میڈیا کے بارے میں آگے چل کر بات کریں گے)۔ اور اسے اس بات کا بھی اچھے سے اندازہ تھا کہ اس سب کے بعد اس کے ساتھ کیا کیا ہو سکتا تھا۔ حکومت اس کے خلاف ہو سکتی تھی۔ لیکن۔۔۔۔۔ لوگ اس کے ساتھ ہونے والے تھے۔ اسے لوگوں سے سروکار تھا کیونکہ اسے ”لوگوں“ کی طاقت کا اندازہ تھا۔

”ہم ان لوگوں پہ ہونے والے مظالم نہیں روک سکے۔ دنیا بھر میں احتجاج ہوئے اور ہوتے رہیں گے۔ یہ سب کب ر کے گا میں نہیں جانتا۔ لیکن ایک بات میں ضرور جانتا ہوں۔“ مجمع پہ نظریں جمائے وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ صاف رنگت، کلین شیو چہرہ، کھڑی مغرور ناک، کشادہ پیشانی پہ سلیقے سے پیچھے کی طرف جمے بال اسے وجیہ اور باوقار دکھاتے تھے۔ اسے دیکھنے والے اکثر سوچا کرتے کہ اگر اس عمر میں وہ اتنا وجیہ اور باوقار لگتا تھا تو جوانی کے دنوں میں کس قدر ہینڈ سم رہا ہو گا۔ ایک دو انٹرویوز میں اس سے یہ سوال پوچھا بھی گیا تھا جس کے جواب میں وہ کچھ کہنے کی بجائے ہنس دیا تھا۔ سب لوگ اس پہ نگاہیں جمائے اسے سن رہے تھے۔ کیمرہ مینز دھڑادھڑ تصویریں بنا رہے تھے۔ کلک کلک کی مخصوص آواز وقفے وقفے سے گونج رہی تھی۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”اور وہ یہ ہے کہ ہم ان کی بنیادی ضروریات پوری کرنے میں ان کی مدد کر سکتے ہیں۔ اس تکلیف دہ وقت میں ہم انھیں کھانا اور دوسری بنیادی چیزیں پہنچا کر اپنا حصہ ڈال سکتے ہیں۔ یہ سوچ کہ وہاں لوگ بھوک سے مر رہے ہیں مجھے بہت افسردہ کرتی ہے۔“ نرم سا تاثر لیے گہری بھوری آنکھوں میں واضح کرب ابھرا۔ ہال میں بیٹھا ہر شخص اس کی بات سن کر افسردہ ہوا۔ اس کے تاثرات کو کیمرہ مینز بھرپور انداز میں اپنے کیمرے میں محفوظ کر رہے تھے۔

”میں یہاں اپنی طرف کا حصہ ڈالنے آیا ہوں۔ میں یہاں آپ سب سے آپ کی طرف کا حصہ ڈالنے کی درخواست کرنے آیا ہوں۔ ہم اس مشکل وقت میں اپنے فلسطینی بھائیوں کے ساتھ ہیں اور ہمیشہ رہے ہیں۔“ اپنے مخصوص نرم اور سنجیدہ انداز میں سامنے مجمع پہ نگاہیں مرکوز کیے وہ کہہ رہا تھا۔

”دنیا کا ہر مذہب ہمیں انسانیت کی تلقین کرتا ہے۔ کوئی مذہب انسانیت سے اوپر نہیں ہے نہ ہی ہونا چاہیے۔ مذہب کی تفریق سے پہلے آپ ایک انسان ہیں اور آپ کو دوسرے انسانوں کی مدد کرنی ہے۔ میں انتظامیہ کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے یہ ایونٹ آرگنائز کیا اور مجھے خصوصی طور پر یہاں مدعو کیا۔“ گردن موڑ کر تھوڑے فاصلے پہ موجود ساتھ بیٹھی خاتون کی طرف اشارہ کیا۔ ہال میں موجود ہر شخص کی نظریں خاتون کی طرف مڑیں۔ خاتون نے مسکراتے ہوئے سر کو خم دیا۔

”مسز تھامس کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ یہ پچھلے کئی سالوں سے افریکہ اور ایشیا کے غریب ممالک کے لیے کام کر رہی ہیں۔ ان کا کام واقعی سراہے جانے کے قابل ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہمارے درمیان ان جیسے عظیم لوگ موجود ہیں جن کے لیے انسانیت سب سے پہلے ہے۔ پچھلے ایک سال سے یہ فلسطین کے لیے بھی کام کر رہی ہیں اور ایسے کئی فنڈ ریزنگ ایونٹس ان کی معاونت میں آرگنائز ہو چکے ہیں۔ ان جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی انسانیت زندہ ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا اور لوگوں کی نظریں کبھی اس پر تو کبھی ساتھ بیٹھی خاتون پہ جا رہی تھیں۔

”جو جو شخص اس وقت مجھے دیکھ رہا ہے میں آپ سب سے کہوں گا کہ فلسطین کو نہ بھولیں۔ ظلم کو بھولنے والے ایک دن خود ظلم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس نیک کام میں اپنا حصہ ڈالیں۔ اپنی طرف کا کام کریں اور انسانیت کی مدد کریں۔ شکریہ۔“ وہ خاموش ہوا تو ہال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ اگلے کئی لمحے تالیاں بجتی رہیں۔ لوگ مسکراتے ہوئے اسے داد دیتے رہے۔ وہ سر کو خم دیتے مسکرا کر انہیں دیکھتا رہا۔ کئی

رپورٹرز نے اس سے سوالات کیے وہ مسکرا کر ان کے جوابات دیتا رہا۔ دفعتاً اس کے سیکریٹری نے جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے ایک نظر کلائی پہ بندھی گھڑی پہ ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس ایونٹ کے لیے اس کے پاس اتنا ہی وقت تھا۔ وہ مسز تھامس کی طرف مڑا اور مسکرا کر ان سے الوداعی مصافحہ کرنے لگا۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتی رہیں۔ ان کے ساتھ اور بھی کئی لوگ موجود تھے۔ اگلے چند منٹ وہ ان سب سے مسکرا کر ہاتھ ملاتا رہا۔ پھر ایک الوداعی نظر مجمع پہ ڈال کر ہاتھ ہلاتا باہر کی طرف بڑھ گیا۔ سیکریٹری، اس کا عملہ اور گارڈز فوراً اس کے پیچھے لپکے۔

”التمش سر۔۔۔“ ہال سے باہر نکل کر وہ تھوڑی ہی آگے بڑھا تھا کہ پیچھے سے آنے والی آواز پر رک گیا۔ وہ کوئی لڑکی تھی جو شاید اس تقریب میں شرکت کرنے آئی تھی۔ التمش کمال پلٹ کر اس لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔ چہرے پہ سادہ سی مسکراہٹ تھی۔ گہری بھوری آنکھوں میں ٹھہراؤ اور نرم سا تاثر ہنوز قائم تھا۔ یہ مسکراہٹ اور آنکھوں کا نرم سا تاثر اس کی شخصیت کا خاصا تھا۔ گارڈز فوراً الٹ ہو گئے۔ لڑکی قدم قدم چلتی اس تک آئی اور پھر مخصوص فاصلے پر رک گئی۔

”سر میں آپ کی بہت بڑی فین ہوں۔ ایکچولی میں بزنس اسٹوڈنٹ ہوں اور بزنس میگزینز میں آپ کے بارے میں پڑھ پڑھ کر مجھے آپ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ انفیکٹ میں نے یہ ایونٹ آپ کی وجہ سے ہی اٹینڈ کیا ہے۔“ لڑکی پر جوش سے انداز میں مسکراتے ہوئے اسے بتا رہی تھی۔

”آپ کا نام کیا ہے؟“ اس طرح کی گفتگو اس کے لیے عام تھی۔ ایسی تقریبات میں اسے یہ سب سننے کو ملتا رہتا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کی بہت اہم میٹنگ تھی۔ اسے دیر ہو رہی تھی لیکن پھر بھی وہ رک کر بات کر رہا تھا کیونکہ وہ التمش کمال تھا۔

”ایزابیلا۔“ لڑکی نے اسی پر جوش انداز میں نام بتایا۔

”ایزابیلا آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ امید ہے آپ اپنے اس سفر میں بہت کامیاب ہوں گی۔“ اس نے بھی جواباً مسکراتے ہوئے کہا اور سر کو خم دیتا آگے بڑھ گیا۔ پیچھے کھڑکی ایزابیلا مسکراتے ہوئے اسے آگے جاتا دیکھتی رہی۔

☆☆☆☆☆

سان فرانسسکو۔۔۔ پہاڑوں کے درمیان بستا خوبصورت شہر۔۔۔ امریکہ کے بڑے شہروں میں سے ایک شہر۔۔۔ اپنی خوبصورتی میں بے مثال شہر۔۔۔ دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں شمار ہونے والا شہر۔۔۔ سبزے اور ہریالی سے بھرپور شہر۔۔۔

شہر کے ارد گرد موجود پہاڑوں پہ کھڑے ہو کر دیکھو تو یہ نظارہ دنیا کا خوبصورت ترین نظارہ لگتا ہے۔ پہاڑوں کے سامنے بستا شہر اور اس کے آگے ٹھاٹھیں مارتا سمندر آنکھوں کو وہ سکون بخشتے ہیں کہ انسان کی ساری تھکن لمحوں میں دور ہو جاتی ہے۔ سان فرانسسکو کے پہاڑوں اور سمندر کو پیچھے چھوڑتے آگے بڑھو تو شہر کا نظارہ واضح ہوتا ہے۔ خوبصورت گلیاں، اونچی عمارتیں، رنگ برنگی گاڑیاں، جگہ جگہ موجود درخت اور ہریالی، مختلف ممالک سے آکر بستے لوگ، اپنے کام سے کام رکھتے اور اپنی دنیا میں مگن رہتے لوگ۔۔۔ تیز تیز بولتے اور آگے بڑھتے یہ لوگ سان فرانسسکو کو ایک مصروف شہر دکھاتے تھے۔ مزید آگے چلتے جاؤ تو رہائشی علاقے شروع ہوتے تھے جن میں مختلف رنگوں کی بنی خوبصورت عمارتیں موجود تھیں۔ انھیں میں سے ایک عمارت کے تیسرے فلور پہ بنے ایک اپارٹمنٹ میں دے قدموں داخل ہو تو منظر قدرے واضح ہوتا تھا۔

اپارٹمنٹ کے دروازے میں کھڑے ہو کر چاروں اور نظر دوڑاؤ تو ہر چیز سلیقے اور نفاست سے اپنی جگہ رکھی دکھائی دیتی تھی۔ اوپن کچن، سیٹنگ ایریا، ایک کمرے اور باتھ روم پہ مشتمل وہ اپارٹمنٹ چھوٹا مگر کھلا سا تھا اور مہنگے انٹیریر اور سجاوٹ کی باعث بے حد خوبصورت دکھتا تھا۔ کمرے میں سے اس وقت کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ قدم قدم چلتے آگے بڑھو تو کمرے میں ایک لڑکی الماری میں منہ دیئے کچھ ڈھونڈتی دکھائی دے رہی تھی۔

اپارٹمنٹ کے بیرونی حصے کی طرح یہ کمرہ بھی اپنے مالک کی نفاست کا صاف پتا دیتا تھا۔ ہر چیز ترتیب سے اس انداز سے سیٹ کی گئی تھی کہ کمرہ بہت بڑا نہ ہونے کے باوجود بھی کھلا کھلا سا لگتا تھا۔ کمرے میں ایک عدد بیڈ، نائٹ ٹیبل، الماری، دیوار پہ لگے شیلف اور اسٹڈی ٹیبل کے علاوہ کوئی بھی اضافی چیز موجود نہیں تھی۔ بیڈ کے ایک طرف بالکنی کو کھلتا دروازہ تھا جس کے آگے اس وقت بھاری پردے گرے ہوئے تھے۔ جبکہ اسٹڈی ٹیبل کے ساتھ تھوڑے فاصلے پہ باہر کی طرف کھلتی کھڑکی موجود تھی جو اس وقت کھلی تھی اور سورج کی روشنی اندر آتی کمرے کو روشن کر رہی تھی۔

کمرے میں سب سے نمایاں چیز اسٹڈی ٹیبل تھا اور وجہ اس کے عین اوپر دیوار پہ لگا بڑا سا بورڈ تھا۔ اسٹڈی ٹیبل کے ایک طرف کرسی رکھی تھی اور دوسری طرف دیوار تھی۔ دیوار پہ اسٹڈی ٹیبل جتنا ہی لمبا چوڑا بورڈ لگا تھا جو پہلی نظر میں اسٹڈی ٹیبل کا ہی حصہ معلوم ہوتا تھا۔ بورڈ پہ جابجا اسٹکی نوٹس، اخبارات کے کاٹے ہوئے تراشے، تصویریں اور ایسی ہی دوسری چیزیں موجود تھیں۔ اسٹڈی ٹیبل پہ ایک طرف لیمپ اور اس کے ساتھ لاتعداد فائلز موجود تھیں اور ترتیب سے تین ڈھیریوں کی صورت رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے آگے چند کاغذات بکھرے پڑے تھے۔

الماری میں کچھ تلاش کرتی لڑکی پلٹ کر اسٹڈی ٹیبل کی طرف آئی تو اس کا چہرہ واضح ہوا۔ سفید رنگت، کشادہ پیشانی، باریک ہونٹ، تیکھی ناک اور سرمئی آنکھیں اسے خوبصورت دکھاتی تھیں۔ چہرے پہ سنجیدگی چھائی تھی اور سرمئی آنکھیں۔۔۔ ان میں ایک مخصوص سی اداسی اور عجیب سا ٹھہراؤ معلوم ہوتا تھا۔ وہ آنکھیں کچھ ایسی کشش رکھتی تھیں کہ دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتی تھیں۔ سیاہ بال ڈھیلے ڈھالے جوڑے میں بندھے تھے اور وہ خود بھی اس وقت ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس تھی۔ قدم قدم چلتی وہ اسٹڈی ٹیبل تک آئی اور کرسی اٹھا کر ایک طرف کرتے بورڈ کے بالکل سامنے کھڑی ہو گئی۔ میز کی چوڑائی زیادہ نہیں تھی اس لیے وہ با آسانی ہاتھ بڑھا کر بورڈ پر کچھ بھی لگا اور اتار سکتی تھی۔ سینے پہ ہاتھ باندھے وہ چند لمحے پر سوچ انداز میں آنکھیں چھوٹی کیے بورڈ پہ نظریں دوڑاتی رہی۔

بورڈ پہ دائیں طرف ایک تصویر لگی تھی۔ تصویر پہ بڑا سا A لکھا تھا۔ کچھ فاصلے پہ ایک اور تصویر لگی تھی جس پہ اسی طرح بڑا سا B لکھا تھا۔ ان دونوں تصویروں کے نیچے عین درمیان میں اس کی اپنی تصویر لگی تھی اور نیچے دائیں طرف چھوٹے الفاظ میں کچھ لکھا تھا۔ ذرا غور کرو تو وہاں اس کا نام لکھا تھا۔ احلام دمیر۔۔۔

اے اور بی والی تصویروں کے نیچے رنگ برنگے اسکی نوٹس اور اخبارات سے کاٹے گئے تراشے موجود تھے۔ اے والی تصویر کے نیچے ایک اضافی چیز چھوٹی کٹی ہوئی تصویریں بھی تھیں جبکہ بی والی تصویر کے نیچے والا حصہ تصویروں سے خالی تھا۔ اگلی کتنی ہی دیر وہ اوپر سے نیچے، دائیں بائیں ایک ایک چیز پہ غور کرتی اور نظریں دوڑاتی رہی۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کے چہرے پہ موجود مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی یوں جیسے وہ سامنے موجود معلومات سے مطمئن ہو۔ ایک نظر اس نے نیچے موجود فائلز کے پلندے پر ڈالی، مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔ ذرا غور کرو تو اس کے مسکرانے پہ بائیں طرف ہلکا سا ڈمپل پڑتا تھا جو ہنسنے پر یقیناً مزید واضح ہوتا تھا۔

”چار سال میں نے انتظار کیا ہے۔“ دھیمی سی آواز میں اس نے خود سے یہ الفاظ کہے اور پلٹ کر بیڈ کے ساتھ رکھے سائیڈ ٹیبل کی طرف آئی۔ جھک کر اس کے دراز میں سے کچھ نکالا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے چہرے پہ مسکراہٹ کے ساتھ ایک عجیب سا تاثر تھا۔ دفعتاً اس نے دراز سے نکالی چیز سامنے کی۔ وہ خنجر تھا۔ سنہرے رنگ کا خنجر۔

”فائنلی اس ٹائم ٹو گیٹ سٹارٹڈ۔“ الفاظ اب کی بار سرد سے تھے۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ ہنوز قائم تھی۔ سرمئی آنکھیں سورج کی روشنی میں مزید روشن دکھتی تھیں۔ لیکن اب کی بار ان میں ایک نیا تاثر بھی تھا۔ کوئی انتقام کی آگ سا۔۔۔ کوئی راکھ کر دینے والے خیال سا۔۔۔

احلام دیر اپنے نئے سفر کے لیے تیار لگتی تھی۔

☆☆☆☆☆

لاس اینجلس میں آج دھوپ چھاؤں سا موسم تھا۔ اکتوبر کا اختتام تھا اس لیے موسم میں خنکی سی رہنے لگی تھی۔ پھر آج تو آسمان پہ بادلوں کا بھی راج تھا۔ سورج کی بادلوں کے ساتھ آنکھ مچولی جاری تھی۔ ہلکی ہلکی چلتی ہو اقد رے ٹھنڈی معلوم ہوتی تھی۔ موسم کی بدلتے رنگوں کو نظر انداز کرتے ارد گرد نگاہ دوڑاؤ تو سامنے کھلا سبزہ زار تھا اور اس پہ کافی لوگ موجود دکھائی دیتے تھے۔ یہ لاس اینجلس کے ایک آرٹ کالج کا گراؤنڈ تھا جہاں کچھ اسٹوڈنٹس ٹولیوں کی صورت بیٹھے تھے۔ کچھ اندر باہر آ جا رہے تھے اور کچھ اپنے پراجیکٹس پہ کام کرتے، ہاتھوں میں پکڑے برش کو سامنے کینوس پہ پھیرتے مصروف دکھائی دے رہے تھے۔

وہ بھی اپنے سامنے بڑے سے کینوس کو ایزل پہ سیٹ کیے برش ہاتھ میں پکڑے منہمک سا اپنے کام میں مصروف تھا۔ سیاہ ہلکے گھنگھریالے بال قدرے لمبے ہونے کے باعث اس وقت پونی میں بندھے تھے۔ سیاہ آنکھیں پر سوچ انداز میں چھوٹی کیے کینوس پہ اوپر سے نیچے پھیرتے وہ اپنے کام سے مطمئن نہیں لگتا تھا۔ دائیں ہاتھ میں برش پکڑے وہ کئی لمحے پر سوچ انداز میں کینوس پہ نظریں جمائے کھڑا رہا۔ گندمی رنگت میں کشادہ پیشانی پہ پڑے بل، چہرے پہ چھائی سنجیدگی، ہلکی بڑھی شیو، ہاتھوں میں بینڈز، گلے میں چین اور بالوں کی پونی، سب چیزیں مل ملا کر اسے پورا پورا آرٹسٹ دکھاتی تھیں۔

”کیا ہوا ایسے کیوں کھڑے ہو گئے؟“ سامنے سے آتی آواز پہ وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا جس کا وہ پورٹریٹ بنا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو ٹھہر سا گیا۔ سورج اسی لمحے بادلوں کے پیچھے سے نکل کر سامنے آیا تو ہر چیز سنہری روشنی میں نہا گئی۔ جس چیز کی اسے کمی محسوس ہو رہی تھی وہ اسے مل گئی تھی۔ سورج سامنے بیٹھی لڑکی کے دائیں رخ پہ تھا اس لیے سنہری کرنیں اس کی ہلکی بھوری آنکھوں کو سنہرا دکھا رہی تھیں۔ آنکھوں کا یہ سنہرا پن وہ پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا مگر ہر بار ایک ہی منظر کو دیکھتے اسے کچھ نیا مل جاتا تھا۔ آرٹسٹ لوگوں کو ایک ہی چیز کو بار بار دیکھنے پر بھی ہر بار کچھ نیا مل ہی جایا کرتا ہے۔ بے اختیار اس لے لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔ وہ زمین پہ پڑے اپنے بیگ کی طرف جھکا۔

”تھینک یو لاریب۔“ مسکراتے ہوئے زیر لب بڑبڑایا۔

”معاویہ۔۔۔ مجھے بھی بتاؤ نا کیوں مسکرا رہے ہو۔“ لاریب کے خفگی سے کہنے پہ اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہوئی۔ وہ جب جب اسے ایسے خفا سے انداز میں پکارتی تھی پتا نہیں کیوں اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ بیگ سے موبائل برآمد کرتے وہ سیدھا ہوا۔

”ایسے ہی بیٹھی رہو۔ میں تمہاری ایک پکچر لے رہا ہوں۔ پھر بتاتا ہوں۔“ وہ خفگی سے اسے دیکھتے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی، تصویر بنوائی، اور اس کے موبائل رکھتے ہی پھر سے بول پڑی۔

”آج چوتھا دن ہے۔ تم نے میرے پورٹریٹ کو اور کتنے دن لگانے ہیں؟ اور یہ اب پکچر لینے کا کیا مطلب ہوا؟ اوپر سے تم مجھے دکھا بھی نہیں رہے۔“ انداز ہنوز خفگی لیے ہوئے تھا۔ معاویہ نے مسکراتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ایک بار پھر ٹھہر سا گیا۔ گلابی رنگ کی خوبصورت گھیر دار لانگ اسکرٹ پہ سفید سادہ ساٹاپ پہنے، بھورے بالوں کی پونی ٹیل بنائے، ماتھے پہ کٹے بالوں کو ایک طرف گرائے، بھرے بھرے گالوں اور بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی غصیلی نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ سفید رنگت میں غصے کے باعث اس وقت سرخی سے گھلی ہوئی تھی۔ سورج کی روشنی میں آنکھیں سنہری سی دکھ رہی تھیں۔ غصے میں وہ اسے کچھ زیادہ ہی خوبصورت لگتی تھی۔ معاویہ نے بے اختیار نظریں چرائیں۔

”بس فائنل ٹچ رہ گیا ہے۔ کل پکا دکھاؤں گا۔ آگے ٹھہر اس لیے گیا تھا کیونکہ کچھ کمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ ادھور اسالگ رہا تھا۔ اب لگتا ہے سب پرفیکٹ ہے۔ اور پک اس لیے بنائی ہے تاکہ گھر جا کر اسے کمپلیٹ کر سکوں۔ کوئی کلر مس نہ ہو جائے۔ تمہارے پوز کی ہم نے فرسٹ ڈے جو پکچر بنائی تھیں ان میں ایک کلر مسنگ تھا۔“ معاویہ نے مسکراتے ہوئے واپس برش ہاتھ میں لیا اور کینوس پہ نظریں جمائے اس کی ایک بات کا نرمی سے جواب دیا۔ اس کی کسی بھی بات کو وہ نظر انداز نہیں کیا کرتا تھا۔

”کل تمہارا پورٹریٹ کمپلیٹ ہو یا نہ ہو میں نے اپنا اسٹارٹ کر دینا ہے۔ پروجیکٹ سبمٹ کروانے میں صرف پانچ دن رہ گئے ہیں۔ تمہیں کوئی احساس ہے یا نہیں؟ میں نے کہا بھی تھا پکچر زلے کر اسٹارٹ کر دیتے ہیں ایسے سامنے بیٹھنے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ ایسے ٹائم ویسٹ ہوتا ہے مگر تم میری کوئی بات

سنتے ہی نہیں ہو۔“ اب کے وہ مزید غصے سے بولی تھی۔ معاویہ مسکراتے ہوئے اس کی جلی کٹی باتیں سنتا رہا۔ وہ اسے ایسی باتیں سناتی رہتی تھی۔ وہ ہر بار چپ چاپ سنتا تھا۔ یہ معمول کی بات تھی۔

”اگر میں پکچرز سے پورٹریٹ بنانے پہ راضی ہو جاتا تو کچھ کلرز مس ہو جاتے۔ کل جب تم اپنا پورٹریٹ دیکھو گی تب تمہیں میری بات سمجھ آ جائے گی۔“ اس کی بات سنتی لاریب نے ایک گہرا سانس لیا۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ وہ اپنا کام کرتا رہا۔ لاریب ارد گرد نظر دوڑاتی آتے جاتے اسٹوڈنٹس کو دیکھتی رہی۔

”صبح میں نے تمہارے ڈیڈ کافنڈ ریزنگ ایونٹ دیکھا تھا۔ آج تو سارا دن یقیناً نیوز چینلز اسی پہ بات کرتے رہیں گے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ان جیسے لوگ اگر یہ کرنے لگ جائیں تو ضرورت مند لوگوں کے لیے بہت آسانی ہو جائے گی۔“ معاویہ اپنے کام میں مگن کہہ رہا تھا۔ لاریب چونک کر اس کی طرف پلٹی۔ چہرے پہ پھمکی سی مسکراہٹ سجائے وہ اسے سنے گئی۔ یقیناً وہ التمش کمال کے حالیہ ایونٹ کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ اپنے باپ میں اور اس کے ایسے کارناموں میں اس نے عرصہ ہوا دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی۔ لیکن یہ بات وہ معاویہ کو نہیں بتا سکتی تھی۔ اگر بتا دیتی تو وجہ کے بارے میں سمجھا نہیں سکتی تھی۔

”کیا ہوا تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“ معاویہ نے اسے کچھ نہ کہتا دیکھ کر سر اٹھا کر اسے دیکھتے پوچھا۔

”ایسی بات نہیں ہے۔ ایکجولی میں صبح جلدی میں تھی اس لیے دیکھ نہیں پائی۔“ سادگی سے کہا تو معاویہ نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا اور واپس کینوس پہ جھک گیا۔ لاریب ایک بار پھر ارد گرد موجود اسٹوڈنٹس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ پہلے دن اسے زیادہ دیر اسٹیجیو بن کر بیٹھنا پڑا تھا۔ کل اور آج وہ تھوڑی دیر کے لیے ہی پوز میں بیٹھی تھی۔ پھر معاویہ کے پاس اس کے پوز کی تصویریں بھی تھیں تو ہلنے میں کوئی مسئلہ نہیں

تھا۔ بیٹھے بیٹھے اسے ایک دم کچھ یاد آیا۔ وہ پلٹ کر معاویہ سے کہنے ہی لگی تھی کہ اسے اتنے مگن انداز میں کام کرتے دیکھ کر ٹھہر گئی۔ وہ سنجیدگی سے کینوس پہ نظریں جمائے اپنا کام کر رہا تھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد برش والا ہاتھ اوپر کرتا، ماتھا کھجاتا، آنکھیں پر سوچ انداز میں چھوٹی کرتا پھر تنقیدی نگاہوں سے کینوس کو دیکھتا اور پھر دوبارہ برش پھیرنے لگتا۔ لاریب کتنی ہی دیر بیٹھی اسے یہ کرتے دیکھتی رہی۔ اسے اندازہ ہی نہ ہوا اسے دیکھتے اس کے ہونٹوں پہ ایک نرم سی مسکراہٹ بھی آن ٹھہری تھی۔ اور یہ وہ مسکراہٹ تھی جو صرف اسے دیکھ کر ہی آیا کرتی تھی۔ وہ اپنے آپ میں مگن اور لاریب کے علاوہ ساری دنیا سے بے نیاز اور لا تعلق رہتا تھا اور اس کی یہی بے نیازی اور لا تعلق لاریب کو پسند تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہی تھی کہ ایک دم کھکھلا کر ہنس دی۔ کچھ دیر پہلے باپ کا ذکر سن کر جو اداسی چھائی تھی وہ کہیں غائب ہو گئی۔ منہمک سا معاویہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”کیا ہوا؟“

”تمہارے چہرے پہ پینٹ لگ گیا ہے اور تم۔۔۔۔۔“ ہنسی پہ قابو پاتے وہ بمشکل بولی لیکن اپنی بات مکمل نہیں کر سکی اور ایک بار پھر ہنس دی۔

”اور میں کیا؟ کارٹون لگ رہا ہوں؟“ مسکراتے ہوئے پوچھا۔ لاریب ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلاتے ٹشو بیگ سے نکالتے اس کی طرف بڑھی۔

”بالکل بچوں کی طرح کیوٹ لگ رہے ہو۔“ اس کے ایسے کہنے پہ معاویہ جھینپ سا گیا۔ لاریب کوئی بہت آؤٹ اسپوکن قسم کی لڑکی نہیں تھی، بس کچھ چیزوں کو لے کر وہ کھلے دل سے اظہار خیال کی عادی تھی۔ اس نے ٹشو معاویہ کی طرف بڑھایا۔ پھر گھاس پہ رکھا اس کا فون اٹھا کر کیمرہ آن کرتے فون اس کے

سامنے کیا۔ کمرے میں اپنی شکل دیکھتے معاویہ بھی ہنس دیا۔ کیوٹ نہیں وہ واقعی میں کارٹون لگ رہا ہوں۔ لاریب ہنستے ہوئے ہی پلٹ کر واپس اپنی جگہ پہ آ بیٹھی۔ معاویہ نے پیٹ صاف کرنے کی کوشش کی مگر وہ پوری طرح صاف نہ ہو سکا۔ کچھ دیر وہ کوشش کرتا رہا پھر ٹشور رکھتے واپس کینوس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ معاویہ کو واپس کینوس کی طرف متوجہ ہوتے دیکھ لاریب کو ایک دم یاد آیا وہ اس سے کچھ کہنے والی تھی۔ ایک نظر اسے اوپر سے نیچے دیکھا۔ وہ معمول کے مطابق پورے کا پورے سیاہ رنگ میں ملبوس تھا۔ شرٹ، جینز، جاگرز، جیکٹ، ہاتھوں کے بینڈز اور اسے معلوم تھا بالوں کی نہ نظر آنے والی پونی بھی سیاہ رنگ کی ہی ہوگی۔ اس کی صرف آنکھیں اور بال ہی سیاہ نہیں تھے اس کے علاوہ بھی ہر چیز سیاہ ہوتی تھی۔ وہ سیاہ رنگ کا دلدادہ نہیں تھا اسے سیاہ رنگ سے عشق تھا۔

”کل تم کچھ اور پہن کر آرہے ہو۔ کل میں تمہیں بلیک میں نہ دیکھوں۔ مجھے کچھ کلر فل سائینٹ کرنا ہے۔ تمہیں پتا ہے مجھے ڈارک وائبر نہیں پسند۔“ اب کے اس نے قدرے دھیمے اور سنجیدہ انداز میں کہا۔ معاویہ مسکراتے ہوئے اس کی بات سنتا رہا۔ وہ جانتا تھا اس کا اشارہ کس طرف تھا۔ سیاہ رنگ اس کا پسندیدہ تھا۔ اس پہ جتنا بھی بہت تھا۔ اس کے لباس میں سیاہ رنگ ہمیشہ موجود ہوتا تھا۔ کوئی دن ایسا نہیں تھا جب وہ کچھ سیاہ پہن کر نہ آیا ہو۔ بلکہ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ وہ سیاہ کہ علاوہ کچھ پہنتا ہو۔

”میں کوشش کروں گا۔“

”تم یہ کوشش ہمیشہ ہی کرتے ہو لیکن آج تک یہ کوشش کبھی کامیاب نہیں ہو سکی۔“ وہ جس انداز میں بولی معاویہ بے اختیار ہنس دیا۔

معاویہ کے ایسے ہنسنے پہ وہ کچھ سخت سا کہنے ہی لگی تھی کہ ایک دم ٹھہر گئی۔ اس کا فون بج رہا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر بیگ سے فون نکالتے اس نے اسکرین دیکھی پھر مسکراتے ہوئے فون کان سے لگایا۔ معاویہ بھی مسکراتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”فری ہو گئی ہو لیلی؟“ دوسری طرف سے بغیر سلام دعا کے عجلت بھرے انداز میں پوچھا گیا۔ یہ نام۔۔۔ یہ انداز۔۔۔ اسے کیا کیا نہیں یاد دلاتے تھے۔ چہرے پہ موجود مسکراہٹ ایک لمحے میں غائب ہوئی۔ کچھ دیر پہلے کی اداسی ایک بار پھر غالب آگئی۔ معاویہ نے اس کے بجھتے چہرے کو بخوبی نوٹ کیا تھا۔

”ہاں تقریباً۔“ ایک نظر معاویہ کو دیکھ کر مدھم آواز میں کہا۔

”اوکے۔ میں اسی روٹ پہ تھا۔ سوچا تم سے پوچھ لوں فری ہو گئی ہو تو ساتھ لنچ کرنے چلتے ہیں۔ میں پندرہ بیس منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔“

”اوکے۔ ڈرائیور کو بول دینا میری گاڑی لینے آجائے۔“ اس کے کہنے پہ دوسری طرف سے کال کاٹ دی گئی۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”لاریب۔۔۔ کیا ہوا ہے سب ٹھیک ہے؟ کس کی کال تھی۔“ وہ قدرے پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کا بھنا اور آنکھوں کی اداسی اس نے بغور دیکھی تھی۔

”ہاں سب ٹھیک ہے۔ مومن کی کال تھی لینے آرہا ہے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن اب کی بار لہجے میں بشارت مفقود تھی۔ معاویہ نے ایک سنجیدہ نگاہ اس پہ ڈالی اور واپس کینوس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ جانتا تھا پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا لاریب نہیں بتائے گی۔

”تم نے اس دن پوچھا تھا نا کہ مجھے ایسی ڈریسنگ کیوں پسند ہے؟“ معاویہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ فاصلے پہ موجود دو لڑکیوں کو آپس میں بات کرتا دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتا تھا اس کا اشارہ ان کی اس دن کی گفتگو کی طرف تھا جب انھیں یہ پراجیکٹ ملا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ پرنس ٹائپ ڈریس پہن کر پورٹریٹ بنوائے گی اور پھر اس پورٹریٹ کو اپنے کمرے میں لگائے گی۔ وہ معاویہ کو اس سے پہلے بھی کئی بار بتا چکی تھی کہ اسے ایسی ڈریسنگ پسند تھی کیونکہ ایسے اسے خود پہ واقعی کسی شہزادی کا سا گمان ہوتا تھا۔

”مجھے کسی نے کہا تھا کہ میں ایک پرنس ہوں اور پرنسز elegant ڈریسنگ میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ انھیں ایسا لباس پہننا چاہیے جو ان کے وقار کو بڑھائے۔ جو انھیں ہجوم میں بھیڑ کا حصہ نہ بننے دے۔ جو انھیں معتبر دکھائے۔ کیونکہ شہزادیاں خاص، باوقار اور معتبر ہوتی ہیں۔“ آخری بات پلٹ کر معاویہ کو دیکھتے ہوئے کہی اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے مومن کے آنے سے پہلے اندر جا کر لا کر سے اپنی کچھ چیزیں لانی تھیں۔

”تمہیں یہ کس نے کہا تھا؟“ اس کے پلٹنے سے پہلے معاویہ نے پوچھا۔

”مینا نے۔“ یہ بات کہتے ہوئے اس کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں اداسی کے ساتھ ایک الگ ہی چمک سی تھی۔ اپنی بات کہہ کر وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔ معاویہ وہیں کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ مینا کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن اسے اتنا ضرور پتا تھا کہ وہ لاریب کے لیے بہت خاص تھی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آجایا کرتی تھی لیکن اس کے ذکر سے وہ اداس بھی ہو جایا کرتی تھی۔ وہ اسے کریدا نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ اسے اداس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اندر جاتی لاریب کو دیکھتے اسے معلوم تھا کہ مومن نے ضرور کوئی ایسی بات کہی تھی جس سے اسے ایک دم مینا یاد

آئی تھی اور وہ یوں اداس ہو گئی تھی۔ وہ لاریب کو سالوں سے جانتا تھا، اس سے محبت کرتا تھا لیکن پھر بھی دونوں کے درمیان ایک حد قائم تھی۔ اس سے آگے دونوں میں سے کوئی نہیں بڑھتا تھا۔

بوجھل دل کے ساتھ اندر کی طرف بڑھتی لاریب کمال کا ذہن صرف ایک بات سوچ رہا تھا۔

”مینا مجھے یہ بتانا بھول گئی کہ جلاوطن شہزادیاں کیسی ہوتی ہیں؟“



سیاہ شیشے سے ڈھکی بلند و بالا عمارت پوری شان سے کھڑی تھی۔ ارد گرد سے گزرتے لوگ ایک بار ٹھہر کر سر اٹھا کر اسے مرعوب ہو کر ضرور دیکھتے تھے۔ اپنی ساخت اور رنگ میں وہ عمارت ارد گرد موجود عمارات سے مختلف اور ممتاز تھی اس لیے ہر گزرتے بندے کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتی تھی۔ یہ ایک پرائیویٹ میڈیائیوز چینل کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت تھی۔ عمارت باہر سے جس قدر شاندار تھی اندر سے اس سے کئی گنا زیادہ خوبصورت اور دیدہ زیب تھی۔ قدم قدم چلتے آگے بڑھو، ہر طرف ہوتی چہل پہل، افراتفری اور باتوں کو نظر انداز کرتے لفٹ کی مدد سے اوپر آؤ، سامنے موجود آفس کا شیشے کا دروازہ پار کر کے اندر آؤ تو شاندار سا آفس نظروں کے سامنے موجود تھا۔ آفس کی دیواروں سے لے کر سجاوٹ کو رکھے آرائشی آلات، پردے، فرنیچر ہر چیز ہلکے اور گہرے بھورے رنگ کا امتزاج لیے خوبصورتی سے اپنی جگہ سجدی تھی۔

”تمہیں پتا ہے تم نے اپنے کتنے دشمن بنا لیے ہیں؟“ بڑے سے گہرے بھورے رنگ کے میز کے پیچھے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے بڑی سی عمر کے شخص نے سامنے کی طرف دیکھ کر کہا۔

”نہیں، تعداد کا شمار کرنا میں نے بند کر دیا ہے۔“ سامنے سیاہ شیشے کی دیوار کے قریب کھڑے، پشت پہ ہاتھ باندھے، اس بلندی سے دکھتے دور نیچے چھوٹے چھوٹے بندوں اور گاڑیوں کو دیکھتے قدرے بے نیازی سے کہا گیا۔

”تمہاری ماں تمہارے لیے بہت پریشان رہتی ہے۔“ شیشے کی طرف چہرہ کیے کھڑے، اپنے باپ کی یہ بات سنتے اس کے چہرے پہ بے ساختہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

”آپ کو پتا ہے میں ایمو شنلی بلیک میل نہیں ہوتا پایا۔“ چہرے پہ مسکراہٹ سجائے اب کی بار پلٹ کر جواب دیا۔ صاف رنگت، چمکتی سیاہ ذہانت سے پر آنکھیں، کلین شیو چہرہ، اٹھی ہوئی ناک، ماتھے پہ گرتے بھورے بال، چہرے پہ چھائی بے نیازی دیکھنے والے کو چند لمحے ٹھہر کر دیکھتے رہنے پہ مجبور کر دیتی تھی۔ لیکن اس کی یہ بے نیازی اس کے باپ کو بری طرح کھلتی تھی۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کی شخصیت اور ظاہری خدو خال میں ایک عجیب سی مقناطیسیت ہوتی ہے کہ ہر بندے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ اس کا شمار بھی انھیں لوگوں میں ہوتا تھا۔

”یعنی تم میری بات نہیں مانو گے۔“ میز کے پار بیٹھے تبریز خان نے جیسے تھک کر اس سے پوچھا۔

”تبریز صاحب۔۔۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھانا اگر غلط ہوتا تو میں آپ کی بات ضرور مانتا۔ لیکن کیا کریں یہ غلط نہیں ہے۔“ کرسی کھینچ کر ان کے سامنے بیٹھتے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ جبکہ اپنا نام لیے جانے پہ تبریز خان سمجھ گئے تھے کہ وہ اس بات کو لے کر کتنا سنجیدہ ہے۔ وہ جب جب ان کا نام لے کر کچھ کہتا تھا یہ اس بات کا اشارہ ہوتا تھا کہ وہ حد سے زیادہ سنجیدہ ہے۔ بس جو ہے یہی ہے باقی سب بیکار ہے۔

”فلسطین اور دوسرے وسطی مشرقی ممالک کو کوریج ملنا ضروری ہے پایا۔ جس ملک میں ہم رہ رہے ہیں یہی ان کی تباہی کا سبب ہے۔ یہاں ہوتے مظاہروں کو نیشنل چینلز پہ مثبت رخ سے نہیں دکھایا جا رہا۔ یہ ملک اسرائیل کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ مظلوم مسلمان ہزاروں کی تعداد میں مر رہے ہیں اور حکومت یہ سب دکھائے جانے کے خلاف ہے۔“ چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ سجائے وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ”پبلک میڈیا چینلز کہیں نہ کہیں حکومت سے فنڈنگ لے رہے ہیں اس لیے انھیں حکومت کی بات ماننی پڑ رہی ہے۔ جبکہ ہمارا معاملہ مختلف ہے۔ ہمارا چینل پرائیویٹ ہے۔ ہم حکومت یا کسی بھی اور ادارے سے کوئی فنڈنگ نہیں لے رہے۔ اس لیے یہ ڈراڈھم کا کرہاری آوازوں کو دبانا چاہتے ہیں۔ آپ کیوں ان کے ڈراوے میں آتے ہیں یار؟“ نرمی سے تفصیلی انداز میں انھیں اپنی بات سمجھاتے آخر میں جیسے بے بسی سے پوچھا تھا۔

(پبلک میڈیا چینل وہ چینل ہوتا ہے جس کی پشت پناہی کسی بھی ملک کے حکومتی ادارے کر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے چینل پہ کیا دکھانا ہے کیا نہیں یہ چیز حکومتی ادارہ طے کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہہ لیں کہ حکومت اپنی مرضی کی خبریں چلاتی ہے اور اس چیز کے لیے چینل کو بہت سی فنڈنگ دیتی ہے۔ ہمارے ملک میں اس کی سادہ مثال شریف خاندان کا جیونیوز کو فنڈنگ دینا اور اپنے متعلق اچھی خبریں چلوانا ہے۔ پرائیویٹ میڈیا اس کے بالکل الٹ ہے۔ وہ حکومت سے فنڈنگ نہیں لیتا اور اپنی مرضی کی خبریں چلاتا ہے۔ یوں کہہ لیں وہ آزاد میڈیا ہے۔ بول چینل کی مثال لے لیں جو عمران خان کے بارے میں سچ بیان کر رہا تھا لیکن پھر اس کے مالک کو اتنا مار چر کیا گیا کہ اسے چینل بیچنا پڑا۔ اب بول چینل آزاد نہیں رہا۔)

”عدن۔۔۔ میرے پیارے بیٹے۔۔۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ اگر تم ایمو شنلی بلیک میل نہیں ہوتے تو ٹرسٹ می میں بھی نہیں ہوتا۔“ اس کی ساری تقریر کے جواب میں انھوں نے بڑے آرام سے کہا تھا۔ ان کی بات سن کر عدن تبریز بے اختیار ہنس دیا۔

”پھر پوچھتے ہیں پتا نہیں تم کس پہ چلے گئے ہو۔“ اب کی بار تبریز خان بھی قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔ ان دونوں کا تعلق کچھ ایسا ہی تھا۔ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنا دونوں کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

”پھر بتا دو اب کون سا محاز سر کرنے جا رہے ہو۔“ اب کی بار ان کا انداز ہلکا پھلکا تھا۔ جانتے تھے ڈر تا وہ اپنے باپ سے نہیں تھا تو کسی دوسرے سے یا اس کے باپ سے ڈرنا ناممکن سی بات تھی۔

”میرا ایک دوست ہے اس کے ایک جاننے والے ہیں ان کی فیملی غزہ میں ہے اور خاندان کے کئی افراد کا انتقال ہو چکا ہے۔ اسی پہ ایک ڈاکیومنٹری بنا رہا ہوں۔ کچھ معلومات چاہئیں ہیں۔ ان کے بیانات ریکارڈ کرنے ہیں اور ایسے ہی اور کئی معاملات ہیں اس کے بعد اس سب کو پبلک کیا جائے گا۔“ وہ انھیں تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ ”ٹائم تھوڑا ہے اور کام زیادہ ہے کیونکہ پچھلے دنوں پلستینا العقاد نے سوشل میڈیا پہ اعلان کیا ہے کہ غزہ میں ہونے والی نسل کشی پہ اس نے ایک کتاب لکھی ہے اور کچھ ماہ بعد وہ کتاب منظر عام پہ آرہی ہے۔ اس سے انٹرویو کا پوچھ کر انٹرویواری بیچ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کاموں کی ایک لمبی ناختم ہونے والی لسٹ ہے اور آپ یہاں بیٹھے مجھے ڈرانے اور پیچھے ہٹانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔“ اس کی بات کو سنجیدگی سے سنتے تبریز خان اس کی آخری بات پہ ایک بار پھر ہنس دیئے۔

”اور تمہیں لگتا ہے کہ اس سب کے بعد تمہارے دشمن خاموش بیٹھے رہیں گے؟ میں تمہارے بھلے کے لیے ہی کہتا ہوں یار۔ آئے دن تمہیں دھمکی بھرے میسجز اور فون کالز آرہی ہوتی ہیں، تم خود بتاؤ میں کیا

کروں؟“ اب کے وہ قدرے بے بسی سے بولے۔ عدن نے گہرا سانس لیا۔ جانتا تھا وہ باپ ہیں۔ اس کے لیے فکر مند رہتے ہیں اسی لیے آئے دن اسے اس سب سے دور رہنے کے لیے کہتے ہیں۔

”میری آخری معلومات کے مطابق آپ کی لاڈلی اولاد آپ کا چھوٹا بیٹا معاویہ ہو کر تا تھا۔ پھر آپ کو میری اتنی فکر کب سے ہونے لگ گئی؟“ آنکھیں چھوٹی کر کے غیر سنجیدہ انداز میں پوچھا تو تبریز خان مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا گئے۔

”معاویہ کو بیچ میں لا کر تم بات کو بدل نہیں سکتے۔ اور یہ بات تمہیں بھی اچھے سے پتا ہے کہ کون میری لاڈلی اولاد ہے۔“ عدن جانتا تھا وہ اپنے باپ کا فیورٹ تھا۔ معاویہ اور ان کے بیچ ہمیشہ اختلافات رہے تھے۔ کبھی کبھار بات گھمانے اور انھیں تنگ کرنے کو وہ معاویہ کا ذکر بیچ میں لے آتا تھا، آج بھی اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

”تاریخ کہتی ہے لاڈلی اولاد زیادہ نافرمان اور باغی ہوتی ہے۔ آپ تاریخ کو جھٹلانے کی کوشش کر کے اچھا نہیں کر رہے۔“ افسوس سے نفی میں سر ہلاتے اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ تبریز خان اب کی بار خاموشی سے اسے دیکھتے رہے۔ صحافت اس کا شوق نہیں جنون تھی تبریز خان یہ بات اچھی طرح جانتے تھے۔

صحافت کی دنیا میں اس کا ایک نام تھا، مقام تھا۔ پچھلے تین چار سالوں میں اس کے شوق، لگن اور محنت ہی کی بدولت ان کے چینل کی ریٹنگ بہت بڑھ گئی تھی۔ یہ اس کی بدولت ہی تھا کہ ان کے چینل کا شمار ملک کے جانے مانے نیوز چینلز میں ہوتا تھا۔

”یار نہ کریں۔“ اس نے ایک بار پھر کوشش کرنی چاہی مگر تبریز خان اب کی بار واقعی سنجیدہ تھے۔ گہری سانس لے کر وہ بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”تمہاری ماں بتا رہی تھی کہ تم آؤٹ آف سٹی جا رہے ہو۔“ عدن نے بد مزہ ہو کر واپس پیچھے کوٹیک لگائی۔

”ایک تو میری ماں نے زندگی میں کبھی مجھ سے وفا نہیں نبھائی۔“ وہ اپنے باپ کا ہی نہیں ماں کا بھی لاڈلا تھا۔ دو دن پہلے اس نے انھیں بتایا تھا اور آج اس کا ارادہ اپنے باپ کو بتانے کا تھا مگر اس سے پہلے ہی اس کی ماں یہ کارنامہ انجام دے چکی تھی۔ اسے اب جا کر ان کے اتنے پریشان ہونے کی وجہ سمجھ آئی تھی۔ تبریز خان ویسے ہی سنجیدہ بیٹھے اسے دیکھتے رہے کیونکہ جانتے تھے کہ جب وہ کسی چیز پہ ڈٹ جاتا تھا تو پھر کسی صورت پیچھے نہ ہٹتا تھا۔ کئی لوگوں نے اس سے ہاتھ ملا کر کام کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ ہر ہاتھ جھٹک دیتا۔ اسے دنیا تک حقیقی خبریں پہنچانے کا خط تھا۔ مصلحت کے تحت یا بک کر آدھا جھوٹ آدھا سچ وہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ اور ظاہر ہے اس سب نے اس کے بہت سے دشمن کھڑے کر دیے تھے۔ پھر پچھلے ایک سال سے غزہ میں ہوتے مظالم نے اس چیز کو مزید بڑھا دیا تھا۔ پبلک میڈیا ظالم کو مظلوم دکھا رہا تھا۔ ایسے میں اس کا چینل جب غزہ کے حق میں بول رہا تھا تو نا صرف پبلک میڈیا اور گنائزیشنز بلکہ کئی حکومتی ادارے تک اسے دھمکیاں دے چکے تھے لیکن وہ تھا کہ پیچھے ہٹنے کا نام ہی نہ لیتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ تبریز خان اس کے لیے پریشان رہتے تھے۔

”ایکچولی جس فیملی سے ملنے جانا ہے وہ لوگ یہاں لاس اینجلس میں نہیں ہوتے اس لیے جانا پڑ رہا ہے۔“ اب کی بار اس نے بھی سنجیدگی سے جواب دیا۔

”سیکیورٹی کا کوئی انتظام کیا تم نے؟“ عدن تبریز خان اب کہ اچھا خاصا رنج ہوا تھا۔ ٹھیک ہے اسے دھمکی بھری فون کالز ریسیو ہوتی رہتی تھیں لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پچھلے ایک سال سے وقفے وقفے سے

ایسا ہو رہا تھا لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ یہ بس اسے ڈرانے کی ایک ناکام کوشش تھی اور کچھ نہیں لیکن یہ بات وہ آج تک اپنے ماں باپ کو نہیں سمجھا سکا تھا۔

”سیکیورٹی کی کیا ضرورت ہے پاپا۔ میں نے گن شوٹنگ شوقیہ نہیں سیکھ رکھی۔ اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں میں۔ آپ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں۔ چند دنوں کی تو بات ہے میں واپس آ جاؤں گا۔ اور پھر وہاں کچھ ٹیم ممبرز بھی ساتھ ہوں گے۔ میں اکیلا نہیں ہوں گا۔“ اپنے لہجے کو حتی الامکان نارمل رکھتے اس نے کہا تو تبریز خان گہر اسانس لے کر رہ گئے۔ دونوں باپ بیٹا ایک جتنے ڈھیٹ تھے۔ نہ وہ ان کی بات مانتا تھا۔ نہ وہ اس کی بات سمجھتے تھے۔

”پھر کہتے ہو کہ میں تمہاری بات نہیں مانتا تم کون سا میری مان جاتے ہو۔ تم سے تو کم از کم معاویہ اچھا ہے۔ سیدھی طرح بات تو مان لیتا ہے۔“

”آپ شاید بھول رہے ہیں اس کے بات مان لینے پر آپ کبھی خوش نہیں ہوئے۔ آپ چاہتے ہیں کہ وہ آپ سے میری طرح بحث کرے۔ اور میری بحث پہ آپ چاہتے ہیں کہ میں اس کی طرح آپ کی بات مان لوں؟ کسی نے سچ ہی کہا ہے ماں باپ کسی حال میں اولاد سے خوش نہیں ہوتے۔“ اس نے جس انداز میں کہا تبریز خان بے ساختہ ہنس دیئے۔

”آپ کو معاویہ سے بات کرنی چاہیے۔ آپ دونوں کے درمیان دن بدن زیادہ فاصلہ آتا جا رہا ہے۔“ عدن اب کی بار نرمی سے سمجھانے والے انداز میں بولا۔

”اسے مجھ سے بہت سے مسئلے ہیں یار۔ اوپر سے پورا آرٹسٹ ہے۔ ایسے لوگوں کو سمجھنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔“ ان کا انداز بے بسی لیے ہوئے تھا۔

”خیر مسئلے تو اسے مجھ سے اور مئی سے بھی بہت ہیں۔ پر آپ کو شش تو کریں۔ اس کا برتھ ڈے آرہا ہے۔ آپ کے پاس اسے امپریس کرنے کا گولڈن چانس ہے۔ میں کو شش کروں گا کہ تب تک آسکوں مگر کچھ کنفرم نہیں کہہ سکتا۔“ مسکراتے ہوئے اس نے اپنی بات مکمل کی پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت یہ بات کہتے ہوئے وہ نہیں جانتا تھا کہ بہت جلد اسے معاویہ تبریز خان سے بہت سے مسئلے ہونے والے تھے۔ اس کے اٹھ کھڑے ہونے پر تبریز خان نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”چار گھنٹے بعد میری فلائیٹ ہے۔“ آرام سے ہم پھوڑ کر اس نے تبریز خان کو دیکھا۔ حسبِ توقع ان کے چہرے سے دبا دبا سا غصہ جھلک رہا تھا۔

”اب ایسے روٹھی محبوبہ کی طرح دیکھیں گے تو میں کیسے جاؤں گا۔“ ایک نظر انھیں دیکھتے پچکارتے ہوئے انداز میں کہا تو تبریز خان سر جھٹک کر ہنس دیئے۔ اس کا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ لاڈلی اولاد سے ناراض ہونے کی اداکاری کرنا بھی ایک مشکل امر تھا۔ انھیں ہنستے دیکھ کر ان سے گلے ملتے وہ باہر کی طرف بڑھ گیا۔ لاڈلی اولاد ہونا اور پھر ماں باپ کو خوش رکھنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ لیکن عدن تبریز خان یہ کام بخوبی انجام دے رہا تھا کیونکہ معاویہ کا رویہ اس کے والدین کو ہمیشہ تکلیف پہنچاتا تھا اس لیے وہ پوری کوشش کرتا تھا کہ اس کی طرف سے اس کے والدین مطمئن رہیں۔ تبریز خان مسکراتے ہوئے اسے باہر جاتا دیکھتے رہے۔

☆☆☆☆☆

کراچی، پاکستان۔

کراچی۔۔۔ قائد کا شہر۔۔۔ سمندر کا شہر۔۔۔ نم ہوا کا شہر۔۔۔ اور کسی زمانے میں رہ چکا روشنوں کا شہر۔۔۔

سمندر کے قریب موجود کلفٹن کا پر ہجوم علاقہ۔۔۔ جہاں ہوا نم اور نمکین ہوتی ہے۔ ذرا کان لگا کر سنو تو ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی آواز کی گونج دور تک سنائی دیتی ہے۔ سمندر اور لہروں کو پیچھے چھوڑتے دبے قدموں چلتے آگے بڑھو تو شہر کا نظارہ آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ اونچی عمارتیں، خوبصورت گھر، بے تحاشا شور، پر ہجوم گلیاں، چاروں اور روشنیاں اور ہنستے مسکراتے لوگ۔۔۔

ان سب کو پیچھے چھوڑتے آگے بڑھتے جاؤ تو کہانی کی منزل کلفٹن میں موجود ایک ایسا گھر تھا جو قدیم طرز تعمیر پہ مشتمل تھا۔ باہر سے دیکھنے پہ وہ گھر کسی قدیم تاریخی ورثے کی یاد دلاتا تھا۔ گھر باہر سے جس قدر خوبصورت دکھتا تھا اندر سے اس سے کئی گنا زیادہ خوبصورت تھا۔ چونکہ رات کا وقت تھا اس لیے گھر کی کئی بتیاں جلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

قدم قدم آگے بڑھو۔۔۔ لیکن۔۔۔ ایک منٹ ٹھہرو۔۔۔ کان لگا کر ذرا غور سے سنو۔۔۔ رات کے اس پہر۔۔۔ کسی کی گھٹی گھٹی سسکیوں کی آواز ابھر رہی تھی۔۔۔ گردن گھماؤ۔۔۔ آواز کے تعاقب میں قدم بڑھاؤ۔۔۔ تو آواز دائیں جانب موجود کمرے سے آرہی تھی۔

اندر آؤ تو ایک لڑکی منہ تکیے میں چھپائے، بیڈ پہ اونڈھی لیٹی دھیمی آواز میں رو رہی تھی۔

”وہ ہمیشہ میرے ساتھ ایسا ہی کرتی ہیں۔“ رونے کے ساتھ بڑبڑاہٹ بھی جاری تھی۔ روتے ہوئے اس کی بچی سی بندھ گئی تھی۔ ”اس میں میرا کیا قصور ہے اگر آپ نے مجھے ایک لڑکی بنایا ہے تو؟“ اب کے چہرہ

اٹھا کر کھلی کھڑکی سے نظر آتے تارک آسمان کو شکوہ کنہا نظروں سے دیکھتے کہا۔ لیکن اگلے ہی لمحے چہرہ واپس تکیے پہ گرا دیا اور رونے کا شغل جاری رکھا۔ انسان انسانوں کی دی گئی تکلیف کی شکایت خدا سے ہی تو کرتا ہے۔ وہ بھی یہی کر رہی تھی۔

”وہ اس گھر کا واحد بیٹا ہے تو میں اس گھر کی واحد بیٹی ہوں وہ آخر یہ بات سمجھتی کیوں نہیں ہیں؟“ اب کے اس کے رونے کی رفتار دھیمی پڑی۔ یوں لگتا تھا وہ رو رو کر تھک چکی تھی۔ چند لمحے ویسے ہی چہرہ چھپائے روتے رہنے کے بعد وہ سیدھی ہوتی اٹھ بیٹھی۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر رگڑ کر چہرہ صاف کیا اور رخ کھلی کھڑکی کی طرف موڑ کر بیٹھ گئی۔ پورے چاند کی روشنی کھلی کھڑکی سے اندر آتی اس کے چہرے پہ پڑی تو چہرہ قدرے واضح ہوا۔ کھلتی گندمی رنگت، رویا ہوا صاف چہرہ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جو چاند کی روشنی میں چمک رہی تھیں اور رونے کے باعث سو جن کا شکار دکھتی تھیں۔ بھرے بھرے گال، باریک ہونٹ اور سیاہ لمبے گھنگریالے بال جو اس وقت کھلے تھے اور اس کے چہرے کے اطراف میں گر رہے تھے۔ چہرے پہ معصومیت تھی اور یہ معصومیت اسے مزید پیارا دکھاتی تھی۔

”ہدیٰ دروازہ کھولو بچے۔ اپنی امی سے کوئی ایسے ناراض ہوتا ہے کیا؟“ بیڈ پہ بیٹھی ہدیٰ نے گرن موڑ کر دروازے کی سمت دیکھا جہاں اس کی ماں دروازہ کھٹکھٹاتے اسے دروازہ کھولنے کا کہہ رہی تھی۔

”سو تیلوں والا سلوک کرتے ہوئے انھیں یاد نہیں آتی کہ یہ میری ماں لگتی ہیں۔“ تلخی سے سر جھٹک کر کہتے وہ واپس کھڑکی سے نظر آتے چاند کی طرف متوجہ ہو گئی مگر دروازے پہ ہوتی مسلسل دستک کو نظر انداز نہ کر سکی۔ لیکن یہ تو طے تھا کہ وہ دروازہ نہیں کھولے گی۔

”پتا بھی ہے میں نے دروازہ نہیں کھولنا پھر بھی جان بوجھ کر تنگ کرنا ہے۔“ ہر بار ایسے ہی ہوتا تھا۔ وہ روتے ہوئے اندر آتی تھی اور پھر جو دروازہ بند کرتی تو یہ دروازہ اگلے دن ہی کھلتا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹاتی اس کی ماں جانتی تھی کہ وہ ضد کی کتنی کچی تھی۔ اس نے آج تک دروازہ کھولا تھا جواب کھولتی؟ لیکن پھر بھی موہوم سی امید لیے وہ باہر کھڑیں اسے منانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ اگلی کتنی ہی دیر وہ دروازہ کھٹکھٹاتی اس کی منتیں کرتی رہیں لیکن پھر اسے نہ کھولتے دیکھ کر چلی گئیں۔

ہدیٰ کافی دیر بیٹھی اداس نظروں سے چاند کو دیکھتی رہی پھر گرنے کے سے انداز میں سر تیکے پہ رکھتے لیٹ گئی۔ ”کوئی ماں اپنی دو اولادوں میں اتنا فرق کیسے کر سکتی ہے؟“ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب وہ بچپن سے ڈھونڈ رہی تھی لیکن اسے آج تک نہیں مل سکا تھا۔ ہاتھ سینے پہ باندھے، نظریں چھت پہ ٹکائے بہت آہستگی سے یہ الفاظ اس کے لبوں سے ادا ہوئے۔ ایک آنسو بھی بے اختیار آنکھ کے کنارے سے نکلتا کنپٹی پہ پھسلتا، بالوں میں جذب ہو گیا۔

”اس میں قصور میرے باپ کا ہے۔ اگر وہ میرے سر پہ موجود ہوتا تو کسی کی جرات نہ ہوتی کہ میرے ساتھ ایسا سلوک کرتا۔“ ایک اور آنسو نکلتا کنپٹی سے گزرتا بالوں میں جذب ہو گیا۔ ”کھانے کی میز پہ اس کا انتظار کرو کیونکہ وہ اس گھر کا واحد مرد ہے۔ کہیں جانے کے لیے اس کی اجازت درکار ہے کیونکہ وہ اس گھر کا واحد مرد ہے۔ اپنے لیے فیصلہ لینے کا میرے پاس کوئی اختیار نہیں ہے کیونکہ میں ایک لڑکی ہوں اور فیصلہ لینے کے لیے گھر کا واحد مرد موجود ہے۔“ آنسو لڑیوں کی صورت گالوں پہ پھسلتے جا رہے تھے۔ وہ دھیمی آواز میں یونہی بڑبڑاتی رہی۔ ”گھر کا یہ واحد مرد اپنے گھر کی عورتوں کو نہ عزت دیتا ہے نہ کچھ سمجھتا ہے اور اسے ایسا بنانے والی میری ماں ہے۔ اگر مرد ایسے ہوتے ہیں تو میں مردوں پہ لعنت بھیجتی ہوں۔ اگر بھائی ایسے ہوتے ہیں تو انھیں پیدا ہوتے ہی مر جانا چاہیے۔ اگر بیٹے ایسے ہوتے ہیں تو انھیں شرم سے ڈوب

مرنا چاہیے۔“ لہجے میں نفرت سی تھی، ایسی نفرت جس میں بغاوت کی بو شامل تھی۔ دل میں آگ سی لگی ہوئی تھی، جلن ایسی تھی جیسے کسی نے بھٹی میں جھونک دیا ہو۔ آنکھوں میں ٹوٹے مان کی کرچیاں تھیں، کرب تھا تکلیف تھی، کیا کیا نہیں تھا۔ اس بار کا غم صرف اس بار کا غم نہیں تھا، وہ اپنے ساتھ پچھلے کئی غم لے کر آیا تھا۔ صدیوں پہلے کے زخموں سے ایک بار پھر خون رسنے لگا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی کس کس چیز کا غم منائے؟ اس باپ کا جو اسے یہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا؟ اس ماں کا جسے اپنے بیٹے کے علاوہ کچھ دکھتا ہی نہیں تھا؟ یا اس بھائی کا جس نے اس کی زندگی کو اپنی بلا وجہ کی روک ٹوک اور ضدی طبیعت کے ہاتھوں عذاب بنا رکھا تھا؟ آنسو تھے کے تھمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ اس نے انھیں بہنے دیا۔ ایک اسی چیز پہ تو اس کا اختیار تھا۔ اگلی کتنی دیر وہ یونہی چت لیٹے روتی رہی اسے یاد نہیں تھا۔ آنکھیں رو رو کر تھک گئیں، آنسوؤں نے مزید بہنے سے انکار کر دیا، سر پھٹنے کے قریب ہو اتب جا کر وہ چہرہ دونوں ہاتھوں سے رگڑ کر صاف کرتی اٹھ بیٹھی۔ نظر اٹھا کر باہر آسمان کو دیکھا۔ اگلی کتنی ہی دیر وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں چاند کو دیکھتی رہی۔

”میں ہدی ہوں۔“ اب کے اس کی آواز بالکل سرگوشی نما تھی۔ نظریں باہر مرکوز تھیں لیکن ذہن کہیں اور تھا۔ کچھ تھا ایسا جو چاند کو دیکھتے اسے ایک دم سے یاد آیا تھا۔ ”میں نے ہمیشہ مقابلہ کیا ہے۔ میں ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں وہ کام ضرور کرتی ہوں جس سے مجھے منع کیا جائے۔ مجھے بلا وجہ ہر بات میں نہ سننا پسند نہیں ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا وہ نہیں ہو سکتا، اور کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیونکہ میں ایک لڑکی ہوں؟ لڑکی ہونا میری چوائس نہیں ہے تو پھر اسے میرے لیے عذاب کیوں بنا دیا گیا ہے؟“ رات کے اندھیرے میں واحد روشنی چاند کی تھی۔ اس کی زندگی میں واحد روشنی وہ خود تھی۔ اس چاند کو دیکھتے اسے اپنا آپ یاد آیا۔ رات کی تاریکی میں اجالا کرتا یہ چاند دیکھ کر اسے اپنا اصل یاد آیا۔ ”اپنا حق میں کسی صورت نہیں

چھوڑا کرتی اس لیے وہ کام ضرور کرتی ہوں جس سے مجھے منع کیا جائے۔“ بڑبڑاہٹ ہنوز جاری تھی۔ ذہن کی سطح پہ کچھ کر گزرنے کا عزم ہر گزرتے لمحے کے ساتھ پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ ”میرے نام کا مطلب سیدھا راستہ ہے۔ مجھے اپنے لیے راستہ تلاش کرنا ہے تاکہ میں اپنے لیے اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا کر سکوں۔ میں ہدیٰ ہوں مجھے بس یہ بات یاد رکھنی ہے۔“ وہ اگلی کتنی ہی دیر آسمان پہ نگاہیں جمائے یہ جملے دہراتی رہی۔ ”میں ہدیٰ ہوں“ یہ بڑبڑاتی رہی۔ ہلکی ہلکی ہوا چلتی رہی۔ چاند کی روشنی مدھم ہوتی رہی۔ رات دھیرے دھیرے سرکتی رہی۔ وہ نئے سورج کے طلوع ہونے کا انتظار کرتی رہی۔

☆☆☆☆☆

”کم ان۔“ دروازے پہ ہوتی مخصوص دستک پہ سنجیدہ انداز میں اجازت دیتے وہ واپس سامنے کھلے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ چند لمحے دروازے کے کھلنے بند ہونے اور پھر قدموں کے قریب آنے کی آواز سننا رہا لیکن سر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت اب بھی نہ کی۔

”سر۔۔۔“ سیکریٹری کی آواز ابھری تو بلا آخر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“ سیکریٹری کا انداز قدرے محتاط تھا۔ التمش کمال نے گہرا سانس لے کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائی۔ گویا تسلی سے مسئلہ سننے کو تیار ہو۔ صبح کے ہشاش بشاش اور مسکراتے چہرے کی نسبت اب اس کا چہرہ سنجیدہ اور تھکا ہوا لگتا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی وہ ایک بے حد لمبی اور تھکا دینے والی میٹنگ سے فارغ ہوا تھا۔ دو گھنٹے بعد ایک انٹرنیشنل ڈیلیکیشن کے ساتھ اس کی ایک اور میٹنگ تھی اور وہ اسی بارے میں ساری چیزیں ایک آخری بار چیک کر رہا تھا کہ اس کا سیکریٹری اسے ایک نئے مسئلے کے بارے میں بتانے آ گیا تھا۔

”اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ سے ابھی کچھ دیر پہلے ہی مجھے بتایا گیا ہے کہ اکاؤنٹس میں کچھ ایشوز آرہے ہیں۔“ بولتے ہوئے اس کا انداز قدرے دھیمّا تھا۔ اس کی بات غور سے سنتے التمش کے ماتھے پہ بل پڑے۔ ہاتھ آپس میں ملاتے وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ ”میجر کا کہنا ہے کہ کوئی اندر کا بندہ ہی انوالو ہے تبھی یہ ممکن ہے۔ فلحال اتنا زیادہ نقصان نہیں ہوا لیکن اگر جلد از جلد اس بندے کو نہ ڈھونڈا گیا تو مزید نقصان ہو سکتا ہے۔“ آخری بات پہ التمش کے جبرے سختی سے آپس میں پیوست ہوئے۔ اس کی کمپنی میں کوئی اس کی ناک کے نیچے اسے دھوکا دے رہا تھا اور اسے خبر تک نہ ہوئی تھی۔

”چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مجھے اس انسان کا پتا ڈھونڈ کر دو ڈیوڈ۔ یہ ایمپائر میں نے اپنی خون پسینے کی محنت سے کھڑی کی ہے اسے نقصان پہنچانے کی اجازت میں کسی کو نہیں دے سکتا۔“ ماتھے پہ بل ڈالے، آنکھوں میں تیش لیے وہ بولا تو الفاظ اندر لگی آگ کی نسبت ٹھنڈے تھے۔ ایک سنجیدہ نظر اس پہ ڈال کر کہا تو ڈیوڈ سر ہلاتا، ”یس سر“ کہتا باہر کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو وہ اپنے تنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑتے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا گیا۔ چند لمحے دائیں ہاتھ سے کنپٹی کو سہلاتا رہا لیکن کوئی فرق نہ پڑا۔ اندر کا اضطراب کسی طور کم نہ ہوا۔ آخر کون تھا جو ایسی گری ہوئی حرکت کر سکتا تھا؟ اتنی بڑی ایمپائر میں ہزاروں کی تعداد میں ورکرز تھے۔ ان میں سے ڈیپارٹمنٹ ہیڈز کے علاوہ وہ بہت کم لوگوں کو جانتا تھا۔ اور سب کے بارے میں جاننا ضروری بھی نہیں تھا۔ اگلی کتنی ہی دیر وہ یوں ہی تھکے تھکے سے انداز میں سیٹ کی پشت پہ سر گرائے بیٹھا رہا۔ زندگی میں پہلے مسئلے کم تھے جو ایک اور کا اضافہ ہو گیا تھا۔

سفید ٹائلز سے مزین فرش آفس میں لگی لائٹس کی روشنی میں مزید چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک طرف شیشے کی دیوار تھی جس کے آگے گہرے سبز رنگ کے صوفے رکھے تھے اور روشنی بنا کسی دقت کے اندر داخل ہو رہی تھی۔ آفس کافی کھلا اور کشادہ تھا۔ شیشے کی دیوار کے بالکل سامنے وہ بڑی سی میز کے پار

موجود کرسی پہ نیم دراز آنکھیں موندھے بیٹھا تھا۔ پیچھے دیوار پہ بیش قیمتی پینٹنگز لگی تھیں۔ میز کے دائیں جانب والی دیوار میں بڑی سی کھڑکیاں موجود تھیں جو اس وقت کھلی تھیں اور پردے ایک طرف گرے تھے جبکہ بائیں جانب والی دیوار میں ریکس لگے تھے جن پہ بیشتر فریمز، سرٹیفیکیٹس اور اس کے ایوارڈز رکھے تھے۔ پورا آفس سفید اور سیاہ اور سفید رنگ کے امتزاج سے سجا تھا۔ دیواریں، فرش، پردے، آرائشی آلات ہر چیز کو انھیں دور نگوں کی مناسبت سے سجایا گیا تھا۔ باہر سے آتی روشنی کے باوجود آفس کی چند لائٹس آن تھیں۔

آفس میں پھیلی روشنی شیشے کی میز سے منعکس ہوتی اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی۔ چہرہ پہلے سے زیادہ تکان زدہ لگتا تھا۔ اگلی کتنی ہی دیر وہ آنکھیں موندے سر سیٹ کی پشت پہ ٹکائے یوں ہی بیٹھا رہا پھر جیسے کچھ یاد آنے پہ ایک دم چونک کر سیدھا ہوا۔ ہاتھ بڑھا کر میز کی دائیں طرف موجود دراز کھولا۔ سامنے سگار کیس رکھا تھا اور اس کے ساتھ کچھ پرانی فائلز رکھی تھیں۔ ان فائلز کے نیچے سے کچھ نکال کر دراز بند کرتے واپس ٹیک لگا کر بیٹھتے اب کی بار اس کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ ایک لڑکی کی تصویر تھی۔ تصویر میں نظر آتے لڑکی کے چہرے پہ خوشگوار سی مسکراہٹ سچی تھی اور آنکھیں جگنوؤں کی مانند چمک رہی تھیں۔ آنکھوں میں چمک لیے، ہونٹوں پہ پرسکون سی مسکراہٹ سجائے وہ تصویر میں نظر آتے خوبصورت چہرے کو دیکھے گیا۔

”مینا۔“ بہت دھیمی آواز میں یہ نام اس کے لبوں سے ادا ہوا۔ تصویر میں نظر آتے مینا کے مسکراتے چہرے پہ دھیرے سے انگوٹھا پھیرتے وہ یوں ہی مسکراتا رہا۔

”تمہارے جانے کا غم اپنی جگہ لیکن۔۔۔ تمہارے ہونے کا احساس مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے۔“ انگوٹھا مینا کی مسکراہٹ، اس کی آنکھوں، اس کے بالوں پہ پھیرتے وہ کتنی ہی دیر اسے دیکھتا رہا۔ یہ وہ چہرہ تھا جسے وہ

کبھی اپنی نظروں سے او جھل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا مگر۔۔۔ قسمت کے کھیل کے آگے انسان ہار جاتا ہے۔

”تم میری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہو۔ تمہارا خیال مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے ورنہ دنیا تو میری تباہی کی دعائیں مانگتی پھر رہی ہے۔ میں نے اس دنیا کو ہمیشہ دیا ہی ہے پھر ناجانے کیوں وہ مجھ سے سب کچھ لینے پہ تلی ہوئی ہے؟“ آخری بات کہتے ہوئے اس کا انداز قدرے افسردگی لیے ہوئے تھا۔

”تمہارا چہرہ دیکھتا ہوں تو کچھ دیر کے لیے ہی سہی غم بھول جاتا ہوں۔ تمہارا چہرہ نظروں سے او جھل ہوتا ہے تو میری سارے غم پھر سے جاگ جاتے ہیں۔ تم میری لیے کیا ہو یہ بات شاید میں اگلی دس صدیوں میں بھی کسی کو نہیں سمجھا سکتا۔“ اب کے لہجہ اور الفاظ دونوں تھکن زدہ سے لگتے تھے۔ اگلی کتنی ہی دیر وہ مینا کی تصویر پہ نگاہیں جمائے اس پہ نرمی سے ہاتھ پھیرتے اس سے باتیں کرتا رہا۔ آفس میں موجود روشنی ویسے ہی اس کے چہرے پہ پڑتی رہی۔ ارد گرد موجود ہر شے دم سادھے اسے سنتی رہی۔ ہر شے پہ اداسی اور افسردگی کی چادر گہری ہوتی چلی گئی۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

☆☆☆☆☆

سان فرانسسکو کا یہ علاقہ سارے شہر کی نسبت کم قیمت پہ ملتے فلیٹس کی وجہ سے مشہور تھا۔ یہاں موجود عمارات میں وہ لوگ رہائش پذیر تھے جن کی آمدنی انھیں شہر کے کسی اچھے علاقے میں رہنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ سامنے موجود تین منزلہ عمارت بھی ایسے ہی لوگوں کی پناہ گاہ تھی۔ اگر غور سے دیکھو تو احلام دمیر اسی عمارت کا داخلی دروازہ دھکیلتی سیڑھیاں چڑھتی اوپر تیسری منزل کی طرف جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ اپنے مطلوبہ فلیٹ کے سامنے رک کر اس نے بیل پہ ہاتھ رکھا اور اگلی کتنی ہی دیر رکھے

رکھا۔ دروازہ نہ کھلنے پہ چند لمحوں کے لیے اٹھایا پھر واپس رکھ دیا اور تب تک رکھے رکھا جب تک کہ دروازہ کھل نہ گیا۔

”کیا تم کبھی انسانوں کی طرح نہیں آسکتیں؟“ دروازہ کھلتے ہی شدید تیش کے عالم میں کہا گیا۔ احلام نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ایک ہاتھ میں ٹوٹھ برش پکڑے، منہ پہ لگے ٹوٹھ پیسٹ سمیت، بکھرے بال، نائٹ سوٹ میں ملبوس وہ اس کے سامنے کھڑا بھی ابھی سو کر اٹھا ہوا لگ رہا تھا۔ احلام نے ایک نظر کلائی میں پہنی گھڑی پہ ڈالی جو بارہ بج رہی تھی۔

”یہ کوئی وقت ہے جاگنے کا؟“ ایک ناگوار نظر اس پہ ڈال کر وہ اسے پیچھے دھکیلتی اندر چلی آئی۔

”شریفوں کے گھر کوئی ایسے آتا ہے کیا؟“ تپے تپے سے انداز میں کہا کیونکہ ایک تو اس کے بیل بجانے نے پہلے ہی دماغ خراب کر رکھا تھا اوپر سے اس نے آتے ہی طعنے بھی برسانے شروع کر دیئے تھے۔ احلام دیر چلتے چلتے رکی۔ پلٹ کر اوپر سے نیچے تک غور سے اسے دیکھا۔

”نیکو رومانو۔۔۔ میں شریفوں کے نہیں تمہارے گھر آئی ہوں۔“ سنجیدگی سے اطلاع دینے والے انداز میں کہتی وہ آگے بڑھ گئی۔ نیکو ٹھاہ کی آواز سے دروازہ بند کرتا اس کے پیچھے پیچھے اندر آیا۔

”آرام سے۔۔۔ تمہارا ذاتی فلیٹ ہے۔ یاد رکھا کرو کہ تم غریب ہو۔ ٹوٹ گیا تو اگلے دو ماہ بغیر دروازے کے رہو گے۔“ نیکو نے گہرا سانس لے کر اسے دیکھا۔ لمبے بھورے لیدر کورٹ میں لانگ بوٹس پہنے، بالوں کی پونی ٹیل بنائے وہ ہمیشہ کی طرح ٹپ ٹپ دکھائی دے رہی تھی۔

”ظاہر ہے اب ہر کوئی تمہاری طرح امیر باپ کی بگڑی اولاد تو ہوتا نہیں ہے کہ باپ کا پیسہ ہر وقت اڑاتا رہے۔“ چبھتے لہجے میں جواب دے کر وہ اندر باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

”میں بلیک کافی لوں گی۔“ اسے اندر کی طرف جاتا دیکھ کر اسے بتانا ضروری سمجھا۔

”وہ رہا کچن۔ اٹھو اور بنالو۔ بلکہ ایسا کرنا ایک کپ میرے لیے بھی بنا دینا۔“ ہاتھ سے کچن کی طرف اشارہ کیا۔ احلام ویسے ہی پر سکون انداز میں کوٹ اتار کر صوفے کے ہتھے پہ رکھتی آرام دہ انداز میں بیٹھ گئی۔

”بنا تو میں لوں لیکن میں نے سوچا آج تمہیں مہمان نوازی کا موقع دوں۔“ اب کی بار نیکو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ جب جب ایسے کہتا تھا اس کے تھوڑی دیر بعد خود ہی کافی بنا کر لے آتا تھا۔ احلام نے سامنے میز پر رکھے بند لیپ ٹاپ کو دیکھا پھر ارد گرد پھیلے کاغذات کو۔ عادت سے مجبور ہو کر گہرا سانس لیتے اس نے کاغذ سمیٹنے شروع کر دیئے۔ نیکو کا فلیٹ ایسی ہی تباہ شدہ حالت میں ہوتا تھا اور اسے اچھے سے پتا تھا اسے اس بات سے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد نیکو ذرا انسانوں والے حلیے میں موجود کافی کے

دو مگ میز پر رکھتے خود اس کے سامنے والے صوفے پہ بیٹھ رہا تھا۔

”تم نے جو معلومات کہی تھیں وہ میں نے اس پین ڈرائیو میں سیو کر دی ہیں۔“ لیپ ٹاپ کے پاس رکھی ہو

ایس بی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”مجھے کسی اور کے بارے میں بھی انفارمیشن نکلوانی ہے۔“ کافی کا مگ اٹھاتے وہ سنجیدگی سے بولی۔

”کس کے بارے میں۔“ نیکو کا انداز بھی سنجیدہ تھا۔

”معاویہ تبریز خان۔“ مگ کی طرف بڑھتا نیکو کا ہاتھ وہیں ٹھہر گیا۔ سر اٹھا کر اچھنبے سے اسے دیکھا۔

”کون معاویہ؟“ مگ اٹھا کر واپس پیچھے ہوتے کہا پھر جیسے دماغ میں کچھ کلک ہوا تھا۔ ”ایک منٹ۔۔۔ وہ گلوبل نیوز چینل کے سی ای او کا بیٹا؟“ انداز میں حیرت واضح تھی۔ ”اس کا یہاں کیا ذکر؟ اور تمہیں اس کے بارے میں کیوں انفارمیشن چاہیے اس نے کیا کیا ہے؟“ احلام کی اس سے کیا دشمنی تھی وہ اس بارے

میں کچھ خاص نہیں جانتا تھا۔ احلام نے اسے کبھی ضرورت سے زیادہ معلومات نہیں دی تھیں اس لیے وہ معاویہ کے بارے میں تھوڑا بہت ہی جانتا تھا۔ پھر آج سے پہلے اس نے کبھی معاویہ کے بارے میں انفارمیشن کا کہا بھی نہیں تھا اس لیے اس کا حیران ہونا بنتا تھا۔

”اس نے بھی میری تباہی میں بھرپور حصہ ڈالا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اب مجھے اسے بھی تباہ کرنے کی تیاری شروع کر دینی چاہیے۔“ کافی کا گھونٹ بھرتے وہ پراسوج انداز میں بولی۔

”اور تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟“ نیکو نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اور تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں تمہیں بتاؤں گی؟“

”کیونکہ ہم دوست ہیں۔“ فوراً جواب دیا۔ احلام نے آنکھیں چھوٹی کر کے غور سے اسے دیکھا۔

”تمہیں دوست بنانے سے پہلے میں تمہارا قتل کر دینا پسند کروں گی۔“ انتہائی سنجیدگی سے کہتے وہ واپس کافی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”مجھے لگا تھا تم کہو گی زہر کھا کر مرنا پسند کروں گی۔“ نیکو نے برا سامنہ بنا کر کہتے کافی کا گھونٹ بھرا۔ اسے جیسے واقعی اس جواب کی امید نہیں تھی۔

”مرنے اور مارنے میں سے میرا انتخاب ہمیشہ مارنا ہو گا۔ مرنے کا آپشن میرے پاس نہیں ہے۔“ چند لمحے خاموشی کی نظر ہوئے۔ احلام کافی پیتے الٹ پلٹ کر پین ڈرائیو کو دیکھتی رہی۔ نیکو پراسوج انداز میں نظریں اس پہ جمائے بیٹھا رہا۔ وہ کچھ کچھ پریشان بھی لگتا تھا۔

”میں ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر کہوں گا اس آگ میں خود کو مت جھونکو۔ تم اپنے قد سے بڑے دشمن بنا رہی ہو۔“ اس کا انداز اب کی بار قدرے دھیمہ اور سمجھانے والا تھا۔

”میں بھی ہمیشہ کی طرح کہوں گی مشورہ تب دیتے ہیں جب مانگا جائے۔“ نیکو اس کی بات سن کر ہنس دیا۔ احلام بھی دھیمہ سا مسکرا دی۔

”میں سنجیدہ ہوں۔ تمہارے پاس سب کچھ ہے۔ پھر اس انتقام کے چکر میں پڑ کر کیوں خود کو تھکاتی ہو۔“

”غیر سنجیدہ میں بھی نہیں ہوں نیکو۔ کچھ ہے ایسا جو مجھے معلوم ہے اور تمہیں نہیں معلوم۔ میرے پاس سب کچھ نہیں ہے۔ تم نے وہ زندگی نہیں گزاری جو میں نے گزاری ہے۔ تم صرف وہ دیکھ رہے ہو جو میں اب ہوں۔ جو مجھ سے چھینا گیا ہے اس کے بارے میں تم نہیں جانتے، مجھے وہ واپس چاہیے۔ جس اذیت سے میں گزری ہوں اس سے انھیں بھی گزرنا ہو گا۔ جو میں نے کھویا ہے وہ بھی کھوئیں گے۔ میں تباہ ہوئی ہوں تو وہ بھی ہوں گے۔ میں بس اتنا چاہتی ہوں۔“ اب کے اس کا انداز بے لچک تھا۔ نیکو نے گہرا سانس لے کر اسے دیکھا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”میں صرف یہ کہوں گا کہ تمہارے دشمن خطرناک ہیں۔ محتاط رہنا۔“ احلام چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

”جب دشمن خطرناک ہوں تو آپ کو ان سے زیادہ خطرناک ہو جانا چاہیے۔ پھر میرے دشمن آزاد نہیں ہیں۔ وہ کچھ بھی کرنے سے پہلے سو بار سوچیں گے کیونکہ انھیں اپنے نام، اپنی ریپوٹیشن کا خیال رکھنا ہے۔ جبکہ میں۔۔۔۔۔“ کہتے کہتے وہ رکی۔ ایک محظوظ کن مسکراہٹ ہوٹوں پہ در آئی۔ ”میں گمنام ہوں۔ اور

آزاد بھی۔ مجھے کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پھر کون زیادہ خطرناک ہوا؟“ کافی کا خالی مگ میز پر رکھتے مسکرا کر پوچھا۔ نیکو اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”خیر آزاد تو تم نہیں ہو۔ وہ تم پہ نظر رکھے ہوئے ہیں۔“ نیکو اسے یاد دلانے والے انداز میں بولا۔ اب کی بار احلام کھل کر مسکرائی۔

”ایسا ہی ہے۔ لیکن۔۔۔ میں احلام دمیر ہوں۔ وہ وہی دیکھ رہے ہیں جو میں انھیں دکھا رہی ہوں۔ اور میں انھیں وہی دکھا رہی ہوں جو وہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں انھیں یقین دلارہی ہوں کہ میں کمزور ہوں۔ انھیں لگتا ہے میں ایک عام سی زندگی گزار رہی ہوں۔ جبکہ میں خود کو ایک جنگ کے لیے تیار کرتے خود کو ایک ہتھیار کی طرح تراش رہی ہوں۔“ یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک الگ ہی چمک در آئی تھی۔ یوں جیسے وہ اپنے اس کارنامے سے خاصی محفوظ ہو۔ کافی کا خالی مگ میز پر رکھنے کے بعد وہ نیچے جھکی اور بائیں گھٹنے سے تھوڑا نیچے تک آتے لانگ بوٹ کے اندر ہاتھ ڈال کر ٹانگ کے ساتھ بندھے خنجر کو باہر نکالا۔ وہ اس خنجر کو زیادہ تر اپنے ساتھ ہی رکھا کرتی تھی۔ نیکو سر نفی میں ہلا کر رہ گیا۔ اس کا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”مجھے آج تک سمجھ نہیں آ سکی گنز کے دور میں تمہیں اس قسم کے ہتھیار رکھنے کا خیال کیسے آگیا؟“ اس نے جس انداز میں کہا احلام بے اختیار ہنس دی۔

”گنز کا من چیز ہیں۔ مجھے کا من چیزیں پسند نہیں ہیں۔ پھر اس قسم کے ہتھیار بادشاہت کی علامت ہیں۔ خیر رہنے دو۔۔۔ تم نہیں سمجھو گے۔“ نیکو نے کچھ نہیں کہا وہ واقعی اسے نہیں سمجھ سکتا تھا۔ احلام نے جھک کر خنجر واپس ٹانگ کے ساتھ باندھا پھر پین ڈرائیو اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”معاویہ کی انفارمیشن مجھے جلدی پہنچانا۔“ وہ پین ڈرائیو کوٹ کی جیب میں ڈال کر اسے پہنتے ہوئے بولی۔
 ”ویسے تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے آخر کو اتنی محنت کرتا ہوں میں یہ معلومات اکٹھی کرنے میں۔“ نیکو
 نفی میں سر ہلاتے افسوس کرنے والے انداز میں بولا۔

”ایک منٹ۔۔۔ شکریہ کس چیز کا ادا کرنا چاہیے مجھے؟ ایک ایک چیز کے لیے میں تمہیں باقاعدہ پے کرتی
 ہوں۔ اور تم جیسے نکمے، ال لیگل انویسٹی گیٹر کو تو میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ میری وجہ سے تمہیں کام مل
 رہا ہے۔ کر دی نہ میں نے مجبری تو جیل میں بیٹھے سڑتے رہو گے۔ بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے بھئی۔“ ایک
 تیز نگاہ اس پہ ڈال کر وہ سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

”تو کس نے کہا ہے اپنے باپ کی آدھی جائیداد اس انفارمیشن کے چکر میں مجھ پہ ضائع کرو؟“ نیکو کو تو اس
 کے انداز پہ آگ ہی لگ گئی تھی۔ ہمیشہ غلط وقت پہ وہ اسے ال لیگل ہونے کا طعنہ مارتی تھی۔
 ”زیادہ دماغ نہ خراب کرو میرا۔ جو کام کہا ہے وہ کرو۔ پیسے میں کل تک تمہارے ”آن لائن“ اکاؤنٹ میں
 ٹرانسفر کر دوں گی۔“ ”آن لائن“ پہ زور دے کر سنجیدگی سے کہا اور قدم باہر کی طرف بڑھا دیئے۔ نیکو نے
 دانت پیسے۔ چونکہ ال لیگل ہونے کی وجہ سے اس کا یہاں اکاؤنٹ نہیں بن سکتا تھا اس لیے وہ کئی سال پہلے
 اپنے ملک میں ہوتے ہوئے بنایا گیا ایک آن لائن اکاؤنٹ استعمال کر رہا تھا۔ احلام اس چیز کا طعنہ مارنا بھی
 نہیں بھولی تھی۔

”جس حساب سے تم مجھ پہ پیسے خرچ کرتی ہو میں خوش فہمیاں پالنے لگا ہوں۔ کہیں تمہیں مجھ سے محبت تو
 نہیں ہو گئی؟“ انداز سراسر اسے چڑانے والا تھا۔ جانتا تھا احلام اس بات سے بری طرح چڑتی تھی۔ وہ جو
 فلیٹ کے دروازے کے قریب پہنچ گئی تھی بگڑے تاثرات سمیت پلٹی۔ خونخوار نظروں سے اسے دیکھا۔

”زیادہ خوش فہمیاں نہ پالو۔ ورنہ یہی خنجر تمہاری گردن پہ پھر دوں گی۔ ال لیگل ہو کسی نے آکر خبر بھی نہیں لی۔ یہیں تڑپ تڑپ کر مر جاؤ گے۔“ چباچبا کر کہتی ایک بار پھر اس کے ال لیگل ہونے کے غم کو کریدتی وہ باہر کی طرف بڑھ گئی۔ پیچھے نیکو دانت پیس کر رہ گیا۔

احلام پر سوچ انداز میں بلڈنگ کی سیڑھیاں اترتی نیچے آرہی تھی جب مسلسل ہوتی فون بیل پہ چونک کر کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اسکرین پہ کر سٹینا لکھا دیکھ کر اس کے ہونٹ بے ساختہ مسکراہٹ میں ڈھلے۔

”میں تمہیں ہی کال کرنے کا سوچ رہی تھی۔“ فون کان سے لگاتے بغیر سلام دعا کے کہا تو دوسری طرف موجود کر سٹینا ہنس دی۔ ”مجھے تمہیں کچھ بتانا تھا۔“ اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی احلام سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

”میں نے تمہیں کہا تھا نا کر سٹی ایک دن آئے گا جب میں خود کو اسے مارتے ہوئے دیکھوں گی۔“ دوسری طرف موجود کر سٹینا کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ اس کی بات سن کر رک گئی۔

”چار سال سے آتے خواب میں کبھی تو ایسا ہو گا جب میں مرنے کی بجائے ماروں گی۔ آج میں نے اسے مار دیا۔ اور میرے کہے کے عین مطابق جس دن میں اسے مار لوں گی اس دن میں اپنے انتقام کے سفر کا باقاعدہ آغاز کروں گی۔ آج میں اپنے اس سفر کا آغاز کرتی ہوں۔“ مسکرا کر کہتے دوسری طرف سے کچھ بھی سننے بغیر اس نے کال کاٹ دی۔ ہونٹوں پہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک لیے وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔

☆☆☆☆☆

ایئرپورٹ پہ معمول کے مطابق رش تھا۔ بھانت بھانت کی بولیاں، مختلف رنگ و نسل کے لوگ، اسپیکر پہ ہوتی اناؤنسمنٹ، غرض ہر چیز معمول کے مطابق تھی۔ عدن اس وقت ویٹنگ لاونج میں اپنی فلائٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ ٹیم کل ہی جا چکی تھی۔ وہ کل ایک اہم میٹنگ کی وجہ سے ان کے ساتھ نہیں جاسکا تھا۔ ویٹنگ لاونج میں بیٹھے اسے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی پتا چلا تھا کہ فلائٹ ایک ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ تھی۔ وہ فارغ بیٹھنے کی بجائے لیپ ٹاپ آن کر کے کام میں مصروف ہو گیا۔ صبح کی نسبت چہرے پہ گہری سنجیدگی چھائی تھی اور وہ تھکن زدہ سا لگتا تھا۔ کھٹا کھٹ لیپ ٹاپ پہ ٹائپ کرتے وہ پوری طرح کام میں منہمک دکھائی دیتا تھا۔ دفعتاً فون پہ آتی کال پہ اس نے چونک کر لیپ ٹاپ سے سر اٹھایا۔ اسکرین پہ چمکتے نام کو دیکھتے بے اختیار اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ رنگ گئی۔ چہرے کی تھکن لمحوں میں دور ہوئی۔ گود میں دھرے لیپ ٹاپ کو ساتھ سیٹ پہ رکھ کر پیچھے ہو کر بیٹھتے اس نے فون کان سے لگایا۔

”آپ کی کال نہ آتی تو میں حیرت سے مر ہی جاتا۔“ بغیر سلام دعا کے اس نے کہا تو دوسری جانب موجود اسماء خان ہنس دیں۔

”بد تمیز ماں کے جذبات کا مذاق اڑاتے ہو۔ شرم تو نہیں آتی تمہیں۔“ اسماء مصنوعی خفگی سے اسے کھرکنے والے انداز میں بولیں۔

”میں نے آج ہی دان کی ہے۔ آپ پہلے بتاتی تو میں تھوڑی اپنے پاس رکھ لیتا۔“ وہ اپنے ازلی غیر سنجیدہ انداز میں بولا تو اسماء ایک بار پھر ہنس دیں۔ اس کا یہ انداز صرف ماں باپ کے لیے ہی تھا اور انھیں ہی دیکھنے کو ملتا تھا۔ ورنہ آفس میں کبھی کسی نے اسے اس انداز میں نہیں دیکھا تھا۔ اسٹاف کا ماننا تھا کہ وہ ایک انتہائی سخت اور کھڑوس باس تھا۔ اور یہ کسی حد تک سچ بھی تھا کام کو لے کر وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ اس معاملے میں کسی کو کوئی رعایت نہیں ملتی تھی۔

”تم دونوں باپ بیٹا مل کر کسی دن مجھے پاگل کر دو گے۔“

”یار ممی یہ بہت پرانا ڈائلاگ ہے۔ میں بچپن سے آپ کو یہی کہتے سن رہا ہوں۔ آج تک آپ نہ پاگل ہوئی ہیں نہ آپ نے ڈائلاگ بدلا ہے۔“ وہ لہجے کو سنجیدہ بناتے ہوئے بولا تو اسماء اگلی کتنی ہی دیر ہنستی رہیں۔ وہ جانتا تھا وہ اس کے لیے پریشان ہو رہی ہیں اسی لیے اسے کال کی گئی ہے۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ انھیں ہنسا کر انھیں ہلکا پھلکا محسوس کروانا چاہتا تھا۔ ان کی ہنسی کی آواز سن کر وہ بھی مسکرا دیا۔ گھر سے وہ انھیں مل کر آیا تھا لیکن یہ ان کی عادت تھی کہ وہ فلائٹ سے پہلے ہمیشہ اسے دوبارہ کال کرتی تھیں۔

”محتاج رہنا اور اپنا بہت سارا خیال رکھنا۔ اگر تم اپنے پاپا کی بات مان کر سیکیورٹی کا کوئی بندوبست کر لیتے تو اچھا رہتا پر نہیں۔۔۔ تمہیں تو ماں باپ کو تنگ کر کے ہی سکون ملتا ہے۔“ اسماء اب کے اصل موضوع کی طرف آئیں۔

”سیکیورٹی کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے ممی۔ پھر میں وہاں ٹیم کے ساتھ ہوں گا تو ہر وقت کی سیکیورٹی سے کمفرٹبل نہیں ہوں گا۔ اور ویسے بھی ہفتہ دس دن کی ہی تو بات ہے۔“ وہ انھیں تسلی دیتے ہوئے بولا۔ یہ ساری باتیں وہ انھیں پچھلے دو دنوں سے سمجھا رہا تھا لیکن ان کی پریشانی کسی طور کم نہ ہو رہی تھی۔

”اچھا اس سب کو چھوڑیں مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔“ وہ اس انداز میں بولا جیسے ایک دم سے کچھ یاد آیا ہو۔ ”کیا؟“ اسماء متجسس انداز میں گویا ہوئیں۔

”میں نے آج پھر اسے خواب میں دیکھا۔“ اب کے اس کا انداز قدرے دھیمّا تھا۔ ماں باپ سے اس کا تعلق بڑا دوستانہ سا تھا۔ ان سے کوئی بھی بات کرتے اسے جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ پھر بچپن سے وہ

ان کا لاڈلا بھی رہا تھا تو اسے ہر بات نہ سہی بہت سے باتیں ان سے شیر کرنے کی عادت تھی۔ اس کی بات سن کر اسماء کتنی ہی دیر خاموش رہیں۔ پھر ان کے گہر اسانس لینے کی آواز ابھری۔

”تم اسے بھول کیوں نہیں جاتے عدن۔“ کتنی ہی دیر بعد وہ گویا ہوئیں۔ یہ سوال نہیں تھا وہ جانتا تھا۔ عدن تبریز خان پچھلے کئی سالوں سے ایک ایسے سراب، ایسے خواب کے پیچھے بھاگ رہا تھا جس کے ملنے یا مکمل ہونے کی سرے سے کوئی امید ہی نہیں تھی۔ کچھ معاملات میں انسان بے بس ہوتا ہے۔ اس معاملے میں وہ بھی بے بس تھا۔

”گیس واٹ؟ میں جب جب سوچتا ہوں کہ اب اسے بھول کر آگے بڑھ جاؤں گا تب تب وہ واپس آ جاتی ہے۔ شاید وہ میرے لاشعور کے اس حصے میں جا بسی ہے جہاں اسے نکال باہر کرنا میرے لیے ممکن نہیں رہا۔“ وہ ہنستے ہوئے اس انداز میں بولا کہ فون کے دوسری طرف موجود اسماء مسکرا بھی نہ سکیں۔ اس کا ذکر وہ ہنس کر بھی کرتا تھا تو لگتا تھا رو رہا ہے۔ لہجے میں عجیب سادہ اور کرب خود بخود شامل ہو جایا کرتا تھا۔ اور اس کا یہ انداز اسماء کو آبدیدہ کر دیا کرتا تھا۔

”میں واقعی چاہتا ہوں کہ اس کا خیال میرے ذہن سے نکل جائے۔ دل کے معاملات میں وقت لگتا ہے لیکن کم از کم اس کا خیال آنا تو بند ہو سکتا ہے نا؟“ وہ جیسے ان سے پوچھ رہا تھا۔ ”لیکن جب جب میں ایسا سوچتا ہوں وہ میرے خواب میں حقیقت بن کر سامنے آ جاتی ہے اور میرے سارے ارادوں پہ پانی پھیر دیتی ہے۔“ بالوں میں ہاتھ پھیر کر بولتے بات کے اختتام پہ وہ ایک بار پھر بے بسی بھرے انداز میں ہنس دیا۔ چہرے کی تھکن ایک بار پھر ظاہر ہونے لگی تھی۔ اس کا ذکر، اس کی یاد اسے ایسی تکلیف دیتی تھی کہ وہ تھکن سے چور چور ہو جایا کرتا تھا۔

”کئی سال گزر گئے ہیں عدن۔ اسے دل سے نکالنے کے لیے اور کتنا وقت درکار ہے تمہیں۔“ وہ پوچھنا نہیں چاہتی تھیں کیونکہ یہ ایک ایسا موضوع تھا جو ان کی لاڈلی اولاد کو تکلیف دیتا تھا لیکن وہ یہ ضرور چاہتی تھیں کہ وہ اسے بھول کر آگے بڑھ جائے۔

”مجھے لگتا ہے قدرت یہ چاہتی ہی نہیں کہ میں اسے بھولوں۔ اس معاملے میں میری ساری کوششیں بیکار جاتی ہیں۔ اور حیرت انگیز بات دیکھیں وہ مجھے جانتی تک نہیں ہے۔ اسے پتا ہی نہیں ہے کہ وہ میرے لیے کیا ہے۔“ وہ ایک لمحے کو رکا۔ کرب سے آنکھیں میچ کر کھولیں۔ سب سے بڑا غم ہی یہی تھا کہ وہ اس بارے میں سرے سے کچھ جانتی ہی نہیں تھی۔ پھر جیسے ایک دم سے کچھ یاد آیا تھا۔ ”آپ نے پوچھا نہیں وہ کیسی لگ رہی تھی؟“ یہ بات کہتے ہوئے اس کا لہجہ پر جوش سا تھا۔ اسماء گہرا سانس لے کر بدقت مسکرائیں۔

”کیسی لگ رہی تھی؟“ اس کا انداز ایسا تھا کہ اسماء کو اپنے لہجے میں بشارت پیدا کرنی پڑی۔

”بلکل کسی پری جیسی۔ اس نے وائٹ ڈریس پہن رکھا تھا۔ آپ کو پتا ہے اس پہ وائٹ بہت سوٹ کرتا ہے۔“ اس کی آواز کی خوشی، اس کا کھویا کھویا سا انداز اسماء ہمیشہ کی طرح دلگرفتگی کے عالم میں اسے سنے لگتی تھیں۔

”وہ بہت خوش لگ رہی تھی ایسے جیسے زندگی میں اسے کوئی غم نہ ہو۔ میری دعا ہے کہ وہ ہمیشہ خوش رہے۔“ اسماء خاموشی سے اسے سنتی رہیں۔ اس کے بارے میں ہر بار کی طرح سنتے انھوں نے دل ہی دل میں دعا کی تھی کہ کاش وہ ان کے بیٹے کو مل جائے۔ وہ کئی سالوں سے اس کے لیے خوار ہو رہا تھا وہ اگلے کئی

سال مزید اس کے لیے آرام سے خوار ہو سکتا تھا اس کا انداز ہر بار انھیں یہ باور کرواتا تھا۔ لیکن پوچھنے پہ وہ بڑے آرام سے کہہ دیتا میں جلد ہی اسے بھول جاؤں گا۔

”ہم ایک ویلی میں تھے۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ وہ کسی فیری ٹیل کی پرنسس کی طرح لگ رہی تھی۔“
عدن اپنے سابقہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ اسماء اسے کہنا چاہتی تھیں کہ وہ خاموش ہو جائے مگر کہہ نہیں سکیں۔ عدن اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر ان کے کچھ بولنے کا انتظار کرتا رہا لیکن پھر جیسے اسے احساس ہوا کہ وہ ان پر اپنے اس حصے کو آشکار کر گیا ہے جو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔

”اچھا می فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔ میں وہاں پہنچ کر آپ کو کال کروں گا۔“ اتنا کہہ کر ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے کال کاٹ دی۔ تھک کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگاتے اس نے آنکھیں موند لیں۔ وہ عدن جو سارا دن ہنستا مسکراتا، ہنسی مذاق کرتا رہتا تھا ایک اس کے ذکر پہ آبدیدہ ہو جایا کرتا تھا۔ اس کی یاد، اس کا خیال اسے تھکا دیتا تھا۔ کچھ چیزوں میں انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔ عدن کا ماننا تھا اس کے معاملے میں وہ بے اختیار تھا۔ نہ وہ ملتی تھی نہ اس کا خیال جاتا تھا۔ اب تو سالوں گزر گئے اس نے اسے تلاش کرنا بھی چھوڑ دیا تھا پھر بھی۔۔۔ پھر بھی اکثر ان جگہوں سے گزرتے جہاں کبھی وہ اس سے ملا تھا وہ ٹھہر جایا کرتا تھا۔ ایئر پورٹ کا شور ویسا ہی رہا۔ معمول کی چہل پہل جاری رہی۔ گھڑی کی سوئیاں سست روی سے آگے بڑھتی رہیں۔ اور وہ۔۔۔ وہ پیچھے اس کے خیالوں میں کھویا رہا۔

☆☆☆☆☆

رات کی تاریکی کے چند آخری لمحات باقی تھے۔ سورج کی روشنی رات کی تاریکی میں مدغم ہوتی اسے مات دینے میں پوری طرح کوشاں تھی۔ لمبی تاریک رات کے بعد صبح آہی جایا کرتی ہے۔ لیکن بعض صبحیں

ویسی ہی تاریک ہوتی ہیں جیسی گزر چکی رات ہوتی ہے۔ آج کی صبح بھی کچھ ایسی ہی صبح تھی۔ فجر گزرے کئی ساعتیں بیت چکی تھیں۔ رخسار بیگم کئی بار ہدیٰ کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھ چکی تھیں۔ کئی بار دل چاہا کہ جا کر دروازہ کھٹکھٹائیں، اسے جگائیں کیونکہ اسے کالج جانا تھا۔ پھر آج سے پہلے چاہے کچھ بھی ہوا ہو اس نے کبھی اتنی دیر نہیں لگائی تھی۔ پریشان نظروں سے ایک بار پھر اس کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھتیں وہ کچن کی طرف بڑھ گئیں کیونکہ جانتی تھیں کھٹکھٹانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس نے مزید دیر کر دینی تھی۔

صبح کی روشنی اس قدیم طرز پہ بنے گھر پہ پڑتی اسے مزید خوبصورت دکھا رہی تھی۔ فرش پہ پرانے طرز پہ مٹی سیاہ اور سفید کے امتزاج کی ٹائلز لگی ہوئی تھیں۔ صحن، برآمدے اور گھر کے اندرونی حصے کی دیواریں ہلکے سبز اور سفید رنگ کے پینٹ سے رنگی گئی تھیں۔ صحن اور برآمدے میں کئی طرح کے پودوں کے گملے موجود تھے۔ ایک طرف مٹی پلانٹ اور بوگن ویلیا کی بیلین بھی لگی تھیں۔ کشادہ سے برآمدے میں تین پلرز تھے اور دائیں طرف لکڑی کا پرانے طرز کا ایک تخت رکھا تھا۔ داخلی دروازے سے اندر آؤ تو سامنے کھلا سا ہال تھا جس کے ایک طرف تین کمرے بنے تھے اور بائیں طرف ایک راہداری تھی جس کے اختتام پہ کچن موجود تھا۔ ہال میں موجود تین کمروں میں سے پہلا کمرہ ڈرائنگ روم تھا۔ درمیان والا رخسار بیگم کے زیر استعمال تھا اور کونے میں موجود آخری کمرہ ہدیٰ کا تھا۔ ہال کے دوسری جانب کشادہ سا لاؤنج موجود تھا جس میں ایک طرف صوفے رکھے تھے اور سامنے ایل ای ڈی اسکرین لگی تھی جبکہ دوسری طرف ڈائنینگ ٹیبل رکھا تھا۔ کچن کا ایک دروازہ لاؤنج میں بھی کھلتا تھا اس لیے چیزیں لانے اور لے جانے میں آسانی رہتی تھی۔ لاؤنج میں ہی ایک طرف اوپر دوسری منزل کو جاتی سیڑھیاں بھی موجود تھیں۔ رخسار بیگم ناشتہ بنانے کے دوران ایک بار پھر ہدیٰ کے کمرے کو دیکھنے آئیں جس کا دروازہ ہنوز بند تھا۔

اندر ہدی کے کمرے میں آؤ تو وہ سست روی سے کالج کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ چہرے پہ سنجیدہ اور سپاٹ سے تاثرات سجا رکھے تھے۔ آنکھیں سرخ اور ہلکی ہلکی سو جن کا شکار تھیں جن میں کاجل ڈال کر ان کی سرخی کو کم کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ چہرہ معمول کے مطابق تھا۔ گھنگھریالے بالوں کو پونی میں باندھ کر اس نے دوپٹہ سیٹ کیا اور بلا آخر دروازہ کھول کر باہر چلی آئی۔ رخسار بیگم نے اسے باہر آتے دیکھ کر بے اختیار سکون کا سانس لیا۔

”اچھا ہوا تم آگئیں۔ میں تمہیں بلانے آہی رہی تھی۔“ نرم سی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے انہوں نے کہا تو وہ بغیر انہیں دیکھے سیدھی لاؤنج کی طرف چلی آئی۔ انداز ایسا تھا جیسے سناہی نہ ہو کہ انہوں نے کچھ کہا ہے۔ رخسار بیگم گہرا سانس لیتیں واپس کچن کی طرف چلی گئیں۔ جب جب وہ ناراض ہوتی تھی آنکھیں ماتھے پہ رکھ لیتی تھی۔ رخسار بیگم جانتی تھیں اب اگر ناشتے میں ذرا سی بھی دیر ہوئی تو بغیر ناشتہ کیے کالج چلی جائے گی۔ جلدی جلدی انہوں نے ناشتہ میز پہ لگایا اور چائے کے مگز میز پہ لا کر رکھتیں خود بھی اس کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔

”کیا ابھی تک ناراض ہو؟“ اسے جلدی جلدی ناشتہ کرتے دیکھ کر آہستگی سے بات کا آغاز کیا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ ناشتہ ادھورا چھوڑ کر اٹھ جائے۔ کل رات بھی اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ ہدی نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

”وہ تمہارا بھائی ہے ہدی، تمہارے لیے کچھ بھی غلط نہیں چاہتا۔ ہم لوگ تمہارے دشمن نہیں ہیں بیٹا۔“ ہدی بغیر دھیان دیئے ویسے ہی جلدی جلدی ناشتہ کرتی رہی۔

”بڑا بھائی نے اگر کچھ کہہ دیا تھا تو اس میں اتنا غصہ کرنے والی کیا بات ہے بیٹا۔ وہ تمہارا بھلا ہی تو چاہتا ہے۔ ذرا سا ڈانٹا ہی تو تھا اس نے، تم ڈانٹ سن لیتیں۔“ وہ اسے سمجھانے والے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ چائے کے مگ کی طرف بڑھتا ہدی کا ہاتھ درمیان میں ہی ٹھہر گیا۔ نظر اٹھا کر کاٹ دار نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

”اس نے ذرا سا ڈانٹا نہیں تھا۔ اس نے مجھے ذلیل کیا تھا۔ ڈانٹنے میں اور ذلیل کرنے میں فرق ہوتا ہے۔ میں آپ کے زمانے میں پیدا نہیں ہوئی نا اس لیے مجھے ڈانٹنے اور ذلیل کرنے میں فرق اچھے سے معلوم ہے۔“ تلخی سے جواب دے کر اس نے مگ اٹھا کر چائے کا گھونٹ بھرا۔ رخسار بیگم گہرا سانس لے کر رہ گئیں۔ وہ اسے نہیں سمجھا سکتی تھیں۔

”اچھا مان لو، اگر اس نے کچھ کہہ ہی دیا تھا تو تمہیں کیا آگے سے ایسے جواب دینا چاہیے تھا؟“ انہوں نے پراٹھے کا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”جو مجھ سے جیسے بات کرے گا میں اس سے ویسے ہی بات کروں گی۔ اگر وہ لڑکا ہے اور اسے اختیار ہے کہ وہ مجھے ذلیل کرتا پھرے تو میری ایک بات کان کھول کر آپ بھی سن لیں، میں لڑکی ہوں اور ذلیل کرنا مجھے بھی آتا ہے۔“ بریڈ کے ایک اور سلائس پہ مکھن لگاتے اس نے جس انداز میں کہار رخسار بیگم نے دہل کر اسے دیکھا۔

”اور آپ جو یہاں بیٹھ کر اس کی طرف داری کر رہی ہیں کیا اس کے سامنے بیٹھ کر کبھی اسے سمجھایا ہے کہ اسے بہن سے کیسے بات کرنی چاہیے؟“ بریڈ کا سلائس منہ میں رکھتے ہوئے کہا پھر چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔ رخسار بیگم شاکی انداز میں اسے دیکھ رہی تھیں۔ آج سے پہلے ہدی نے ان سے کبھی اتنی بدتمیزی

سے بات نہیں کی تھی۔ ”میں نے تو آپ کو کبھی اسے یہ سب سمجھاتے نہیں دیکھا۔ جب آپ اسے کچھ نہیں کہہ سکتیں تو ہر بار مجھے سمجھانے کیوں آجاتی ہیں؟ یہ آپ کی ہی وجہ سے ہے کہ وہ ایسا ہے۔ لڑکا لڑکا کہہ کر آپ نے ہی اسے یہ شہہ دے رکھی ہے۔ میرا باپ یہاں موجود ہوتا تو میں دیکھتی کس کی جرأت ہے جو میرے ساتھ ایسا سلوک کرے۔ لیکن کیا کر سکتے ہیں، میری قسمت دیکھیں۔۔۔۔۔ میرے لیے ایسا باپ ڈھونڈنے میں بھی آپ کا ہی قصور نکلتا ہے۔“ اس کی آخری بات سن کر رخسار بیگم کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید پڑ گیا تھا۔ انھیں ہمیشہ لگتا تھا وہ بچی ہے، سمجھ جائے گی، بہل جائے گی۔ آج پہلی بار انھیں لگا تھا وہ بچی نہیں رہی تھی۔ آج پہلی بار انھیں لگا تھا ہدیٰ کے بارے میں ان کے سارے اندازے غلط ثابت ہوئے تھے۔ ادھ کھایا سلائس پلیٹ میں رکھتے، چائے کا آخری گھونٹ بھرتے وہ ایک اچھٹی نگاہ رخسار بیگم پہ ڈالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ سامنے ہی میسم سیڑھیاں اترتا نیچے آ رہا تھا۔ ہدیٰ نے اسے دیکھ کر بھی ان دیکھا کیا اور اپنا بیگ اٹھانے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”کیا اس گھر میں بڑوں کو سلام کرنے کا رواج بھی ختم ہو گیا ہے؟“ سیڑھیاں اتر کر آتا میسم اسے دیکھتے ہی بولا۔ ویسے تو اسے ہدیٰ کی کل والی بدتمیزی پہ بہت غصہ تھا لیکن خود کا اس طرح نظر انداز کیا جانا بھی بری طرح کھلاتا تھا۔

”اس گھر میں آج سے پہلے کبھی کچھ نارمل ہوا ہے؟ اگر یہ رواج بھی ختم ہو گیا ہے تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔“ لاؤنج کے دروازے میں ٹھہر کر بغیر مڑے سنجیدگی سے جواب دے کر وہ باہر نکل گئی۔ میسم شل، ساکت سی بیٹھی رخسار بیگم کی طرف پلٹا۔

”دیکھ رہی ہیں اسے آپ امی، کتنی بد زبان ہو گئی ہے یہ؟“ یہ وہ آخری بات تھی جو کمرے میں جانے سے پہلے اس نے سنی تھی۔ اندر آ کر اس نے جلدی جلدی ایک بار پھر دوپٹہ درست کیا اور بیگ اٹھا کر باہر

برآمدے کی طرف بڑھ گئی۔ وین والا آچکا تھا اور ہارن پہ ہارن دیئے جا رہا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے تیز تیز قدم اٹھاتی گھر سے نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆☆☆

معاویہ اس وقت دوسری منزل پہ موجود اپنے اسٹوڈیو میں تھا۔ اسٹوڈیو کے اندر کھڑے ہو کر ایک نظر ارد گرد ڈالنے پر ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ اسٹوڈیو معاویہ تبریز خان کا تھا۔ اسٹوڈیو کافی کھلا اور کشادہ تھا۔ دیواریں سیاہ رنگ کے پینٹ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ باہر سرسبز لان کی طرف کھلتی بڑی سی کھڑکی کے آگے سیاہ رنگ کے بھاری پردے گرے ہوئے تھے۔ ایک طرف سیاہ رنگ کا لکڑی کا بڑا سامیز رکھا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ اسٹول پہ بیٹھا سامنے موجود کینوس پہ برش پھیر رہا تھا۔ اسٹوڈیو کی دیواروں پہ اس کی بنائی گئی چند پینٹنگز لگی تھیں جن میں سے بیشتر میں سیاہ رنگ خاصا نمایاں تھا۔ اس کے علاوہ کچھ سرمئی اور سفید رنگ میں بھی موجود تھیں۔ کچھ ادھی ادھوری پینٹنگز نیچے دائیں طرف کی دیوار کے ساتھ بھی رکھی ہوئی تھیں۔ پورے اسٹوڈیو میں سیاہ، سرمئی اور سفید کے درمیان صرف تین چار پینٹنگز تھیں جو رنگوں سے بھرپور تھیں۔ اور وہ پینٹنگز لاریب کی تھیں۔ لاریب کو وہ رنگوں میں ہی پینٹ کیا کرتا تھا۔ رنگ اس پہ سوٹ کرتے تھے۔ اسے رنگوں میں ہی رنگا جاسکتا تھا۔

میز پہ ایک طرف پیلیٹ، مختلف اقسام کے برشز اور فون رکھا تھا جس پہ لاریب کی آج بنائی گئی تصویر کھلی تھی اور ساتھ بیٹھا وہ اپنے سامنے کینوس پہ موجود لاریب کے پورٹریٹ کو چند آخری ٹچز دے رہا تھا۔ سیاہ بال دوپہر کی طرح پونی میں بندھے تھے اور خود بھی وہ سادہ سی سیاہ رنگ کی ٹی شرٹ اور ٹراؤزرز میں ملبوس تھا۔ چند لمحے باریک سے برش کو کینوس پہ پھیرنے کے بعد بلا آخر وہ سیدھا ہوتا تھوڑا پیچھے ہو کر کھڑا ہوا۔ پھر اوپر سے نیچے تنقیدی نگاہوں سے لاریب کے پورٹریٹ کو دیکھتے دھیمسا مسکرا دیا۔ ایک آرٹسٹ

کے لیے سب سے اہم بات اپنے کام سے مطمئن ہونا ہوتی ہے۔ وہ بلا آخر مطمئن تھا۔ ایک پرسکون سی سانس خارج کرتے اس نے برش واپس میز پر رکھا اور اپنا فون اٹھایا، ارادہ لاریب کو بتانے کا تھا کہ وہ اس کا پوٹریٹ مکمل کر چکا ہے۔ فون کھولا تو سامنے لاریب کا میسج آیا ہوا تھا۔ اس نے نوٹیفیکیشن پہ کلک کیا۔

”کل تم بلیک میں ہی آنا۔ مجھے کچھ کلر فل پینٹ نہیں کرنا۔“ دو جملوں پہ مشتمل اس کے میسج نے معاویہ کو چونکا یا تھا۔ اسے معلوم تھا لاریب کو رنگ کتنے پسند تھے۔ جب تک ضرورت نہ ہو وہ سیاہ رنگ کا استعمال کرنے سے گریز کرتی تھی۔ پھر دوپہر میں اس نے کہا بھی تھا کہ وہ اسے بلیک میں پینٹ نہیں کرنا چاہتی۔ پتا نہیں پھر اب کیا ہوا تھا جو وہ اسے بلیک میں ہی پینٹ کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ایک نظر میسج پہ دوبارہ ڈالی۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی بھیجا گیا تھا۔ لاریب اس کی زندگی کا وہ انسان تھی جس کی چھوٹی چھوٹی بات بھی وہ بخوبی نوٹ کیا کرتا تھا۔ اسے اس چیز کا بھی اچھے سے اندازہ تھا کہ وہ بہت حساس طبیعت کی مالک تھی۔ آرٹسٹ عموماً حساس ہی ہوتے ہیں۔ وہ خود بھی حساس تھا لیکن یہ بات بھی درست تھی کہ لاریب اس کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ حساس تھی۔ یقیناً کچھ ہوا تھا کہ اس نے ایسا میسج بھیجا تھا۔ اس نے لاریب کو کال ملائی۔ بیل جاتی رہی لیکن لاریب نے کال ریسیو نہیں کی۔ اس نے دوبارہ کال کی لیکن نہیں اٹھائی گئی۔ گھر سانس لیتے وہ فون میز پر رکھتے واپس لاریب کے پوٹریٹ کی طرف متوجہ ہوا۔ اب کے آنکھوں میں واضح پریشانی تھی۔ وہ فون اٹھا لیتی، بات کر لیتی تو اس کی پریشانی دور ہو جاتی۔ یہ محبت بھی بڑی عجیب چیز ہوتی ہے اچھے بھلے بندے کو خوار کر دیتی ہے۔ لاریب سے پہلے اس کی زندگی بھی اچھی بھلی ہوا کرتی تھی لیکن اب۔۔۔ اب وہ اس کی چھوٹی چھوٹی بات پہ بھی پریشان ہوا اٹھتا تھا۔

”معاویہ۔۔۔“ وہ جو اپنے ہی دھیان میں کھڑا لاریب کے مسکراتے چہرے کو پریشان نظروں سے دیکھ رہا تھا چونک کر پلٹا۔ ”تم نے آج کافی کانہیں کہا میں نے سوچا میں خود ہی لے جاؤں۔“ اسماء مسکراتے چہرے

کے ساتھ کافی کاگ تھا مے کھڑی تھیں۔ انھیں دیکھ کر وہ بھی دھیمسا مسکرا دیا۔ باپ اور بھائی کی نسبت ماں کے ساتھ اس کے تعلقات اچھے تھے۔

”ایکپولی آج کام تھوڑا تھا۔ کچھ فائنل ٹرے تھے سو کافی کی ضرورت نہیں پڑی اس لیے میں نے میڈ کو نہیں کہا لیکن اب آپ لے آئی ہیں تو دے دیں۔“ اس نے دھیرے سے کہتے کافی کاگ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ اسماء مسکراتے ہوئے آگے آئیں اور اس کے ابھی ابھی مکمل کیے پوٹریٹ کے سامنے رک گئیں۔

”یہ لاریب ہے نا؟“ مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔ جواباً اس نے بھی مسکراتے ہوئے ہی سر اثبات میں ہلادیا۔

”بہت پیاری لگ رہی ہے۔ کیا اصل میں بھی اتنی ہی پیاری ہے؟“ پوٹریٹ میں نظر آتے اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کر انھوں نے کہا تو کافی کاگھونٹ بھرتے معاویہ کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”یہ اصل میں اس سے کئی گنا زیادہ پیاری ہے۔“ وہ بھی چلتا ہوا ان کے ساتھ آکھڑا ہوا۔ عدن کی طرح اسے اپنی باتیں کسی سے شیم کرنے کی عادت نہیں تھی لیکن لاریب کے بارے میں بات کرنا اسے پسند تھا پھر وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کے گھر والے لاریب کے بارے میں جانیں۔ اس لیے ماں سے اس کے بارے میں بات کرنے میں اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ”یہ اتنی پیاری ہے کہ اس سے زیادہ پیارا کوئی لگتا ہی نہیں۔ جب ہنستی ہے، جب مسکراتی ہے، جب غصہ کرتی ہے، ہر ہر انداز میں پیاری لگتی ہے۔ اس کے چہرے پہ ہمیشہ ایک معصومیت سی موجود ہوتی ہے۔ میں نے آج تک اتنا معصوم چہرہ کبھی کسی کا نہیں دیکھا۔“ مگ ہاتھ میں تھامے، نظریں اس کے مسکراتے چہرے پہ ٹکائے، آنکھوں میں چمک لیے وہ بولا تو اسماء کتنی ہی

دیر اسے دیکھتی رہیں۔ وہ بہت کم ایسے بولتا تھا۔ بلکہ وہ بولتا ہی بہت کم تھا۔ ایک اسماء تھیں جن سے وہ تھوڑی بہت بات چیت کر لیا کرتا تھا ورنہ باپ اور بھائی سے صرف ضرورت کے تحت ہی بات کرتا تھا۔

”پھر کب ملو رہے ہو مجھے اس سے؟“ اسماء نے کہا تو وہ جو اپنے ہی کسی خیال میں کھویا مسکراتے ہوئے لاریب کے پوٹریٹ کو دیکھ رہا تھا چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوا۔ انھیں خود کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے پا کر نجل سا مسکرا دیا۔ اسماء لاریب کے بارے میں کافی پہلے سے جانتی تھیں۔ ان کے دونوں بیٹے ان سے اس قسم کی گفتگو چھپایا نہیں کرتے تھے۔ ہاں عدن کے لیے ان کا دل اداس رہتا تھا لیکن معاویہ کے لیے وہ بے حد خوش تھیں۔

”تمہارا برتھ ڈے آرہا ہے کچھ دنوں میں۔ تم ہمیشہ کسی بھی گرینڈ پارٹی کے لیے منع کر دیتے ہو۔ تمہارے پاپا کو یہ بات کبھی پسند نہیں آئی کیونکہ ظاہر ہے ان کا سرکل ہے لیکن وہ تمہاری بات ہمیشہ مان لیتے ہیں۔ اس بار میں کوئی ایکسکیز نہیں سنوں گی۔ تم لاریب اور اس کی فیملی کو بھی انوائٹ کرنا ایسے میری اس سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“ اسے اپنے باپ سے، باپ کے سرکل سے کوئی لینا دینا نہیں تھا لیکن اسے ماں کی اور ان کے احساسات کی پرواہ تھی۔ اس لیے ناچاہتے ہوئے بھی اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ پھر وہ خود بھی چاہتا تھا کہ لاریب اس کی فیملی سے ملے اور اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسماء اسے اتنی آسانی سے مانتے دیکھ کر مسکرا دیں۔

”تمہیں پتا ہے یہ آئیڈیا عدن کا تھا۔“ عدن کے نام پہ اس کا چہرہ ایک دم سے سپاٹ ہوا تھا۔ وہ اس وقت عدن کا ذکر ہر گز نہیں سننا چاہتا تھا۔ وہ صرف لاریب کو سوچنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال خوش کن تھا۔ چہرے پہ خود بخود مسکراہٹ آجایا کرتی تھی۔ جو انسان دل کے قریب ہوں، جن سے اچھی یادیں جڑی ہوں انسان

انہیں کو سوچنا اور یاد کرنا چاہتا ہے۔ عدن کے نام سے اس کے ذہن میں کبھی کوئی خوش آئند بات نہیں آتی تھی۔ لیکن اسماء اسے نہیں دیکھ رہی تھیں اگر دیکھ لیتیں تو شاید عدن کا نام کبھی نہ لیتیں۔

”اوہ ہاں۔۔۔ میں تمہیں بتانا ہی بھول گئی۔ عدن کچھ دنوں کے لیے آؤٹ آف سٹی گیا ہے۔“ اسماء مزید کہہ رہی تھیں۔ وہ سپاٹ سا چہرہ لیے کافی پیتے سنتا رہا۔ ”کل ڈنر پہ تم لوگوں کی ملاقات نہیں ہو سکی کیونکہ تم اپنی پینٹنگ میں بزی تھی۔ پھر آج صبح تم جلدی کالج چلے گئے۔ وہ تم سے مل کر جانا چاہتا تھا لیکن اس کی فلائیٹ تھی سوا سے بغیر ملے ہی جانا پڑا۔“ اس کی بلا سے۔ اس نے استہزاء سے سر جھٹکا۔ وہ کہاں جاتا تھا کیوں جاتا تھا اسے کوئی پروا نہیں تھی۔

”کہہ رہا تھا تمہیں کال کرے گا۔ اور یہ بھی کہہ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے تمہارے برتھ ڈے تک واپس نہ آ سکے۔“ اسماء اس کے برشز کو اکٹھا کر کے رکھتے مسکراتے ہوئے اسے بتا رہی تھیں۔ وہ معاویہ کو یہ سب بتا کر اس کا دل عدن کی طرف سے صاف کرنا چاہتی تھیں۔ جانتی تھیں معاویہ عدن کو کچھ خاص پسند نہیں کرتا۔ عدن تو اپنی طرف سے ہمیشہ کو شش کرتا رہتا تھا لیکن معاویہ کا رویہ ہمیشہ ہی سرد سا رہا تھا۔ وہ چاہتی تھیں ان کے دونوں بیٹوں میں جو بھی رنجش ہے وہ بس کسی بھی طرح ختم ہو جائے۔ اس وقت وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ بہت جلد یہ رنجش ختم ہونے کی بجائے مزید بڑھنے والی تھی۔ کافی پیتے معاویہ نے عدن کے ہر خیال کو جھٹک کر ایک بار پھر لاریب کو سوچا اور اس کے کال نہ اٹھانے کی پریشانی اسے ایک بار پھر ستانے لگی۔

☆☆☆☆☆

سیاہ رنگ کی لمبورگینی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ لاریب پیسنجر سیٹ پہ آرام دہ انداز میں بیٹھے، بیگ گود میں رکھے، چہرے پہ مسکراہٹ سجائے، نظریں باہر بھاگتے دوڑتے مناظر پہ جمائے، ڈرائیونگ کرتے مومن کو سن رہی تھی جو اپنے آج کے کارنامے سنارہا تھا۔ صاف رنگت، جاذب نقوش، التمش کمال کے جیسی گہری بھوری آنکھیں، کشادہ پیشانی، کلین شیو چہرے پہ سو برس سا تاثر، اسے دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ وہ التمش کمال کا بیٹا تھا۔ سیاہ سیدھے بال کانوں سے ذرا نیچے تک آتے تھے، اطراف سے چھوٹے جبکہ درمیان سے اچھے خاصے گھنے تھے۔ نہ بہت لمبے تھے نہ بہت چھوٹے لیکن اس وقت وہ پونی میں باندھے گئے تھے مگر پونی کے لحاظ سے چھوٹے ہونے کے باعث چند لٹیں نکل کر ماتھے اور اطراف میں گر رہی تھیں۔ باہر دیکھتی لاریب نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ مومن نے اسے خود کو دیکھتے پا کر پوچھا۔

”دیکھ رہی ہوں یہ ہیرا سٹائل تم پہ سوٹ کرتا ہے۔ اس میں زیادہ ڈیشنگ لگتے ہو۔“ مسکراتے ہوئے اس نے کہا تو مومن قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ گاڑی لاس اینجلز کی حدود سے نکل کر بیورلی ہلز میں داخل ہو رہی تھی۔ بیورلی ہلز کا شمار امریکہ کے مہنگے ترین شہروں میں ہوتا تھا۔ یہاں ہالی ووڈ کے کئی ستارے رہائش پذیر تھے۔ اس کے علاوہ ایلٹ کلاس اور بزنس سے تعلق رکھنے والی کئی مشہور شخصیات بھی اسی شہر میں بستی تھیں۔ التمش کمال کا شمار بھی انھیں لوگوں میں ہوتا تھا۔

لاس اینجلز سے بیورلی ہلز صرف بیس منٹ کی ڈرائیو پہ تھا لیکن لاریب کے کالج سے گھر تک تیس پینتیس منٹ لگ جاتے تھے۔ پھر مومن کا کالج بھی لاس اینجلز میں ہی تھا اس لیے اکثر وہ اسے کالج سے پک کر لیتا تھا اور دونوں ساتھ لہجہ کرنے چلے جاتے تھے۔ مومن بزنس ایڈمنسٹریشن میں بچلرز کر رہا تھا۔ لاریب اور اس کا دونوں کا آخری سال چل رہا تھا۔

”تمہارے پراجیکٹ کا کیا بنا؟ تم نے مجھے دکھایا ہی نہیں؟“ مومن کو بات کے دوران ایک دم سے یاد آیا کہ کچھ دن پہلے لاریب نے اپنے ایک بہت اہم پراجیکٹ کا ذکر کیا تھا۔

”مت پوچھو۔ چار پانچ دن رہ گئے ہیں اور ابھی تک میں نے اپنا پوٹریٹ اسٹارٹ ہی نہیں کیا۔ معاویہ کہہ رہا تھا آج وہ میرا کمپلیٹ کر لے گا پھر کل سے فائنلی میں اسٹارٹ کر پاؤں گی۔“ لاریب کے تفصیلی جواب پہ اس نے سر ہلایا۔ لاریب ایک بار پھر باہر کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اسے اپنا شہر اور اس کی ہریالی بے حد پسند تھی۔ پھر اس جیسی آرٹسٹ کے رہنے کے لیے یہ ایک شاندار جگہ تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے سڑکوں کے اطراف میں موجود پودے اور درختوں کو دیکھے گئی۔ مومن کے ساتھ لنچ اچھا رہا تھا۔ ڈیڈ اور مینا کے ذکر پہ جو ادا سی چھائی تھی وہ دور ہو گئی تھی۔ مومن اچھا بھائی تھا اور اس کے لیے مزید اچھا بن جایا کرتا تھا۔ اس نے گردن موڑ کو سنجیدہ نظر آتے مومن کو ایک بار پھر دیکھا۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ مومن نے اسے اپنی طرف مسکراتے دیکھ کر پھر سے پوچھا۔

”دیکھ رہی ہوں کہ ہیں تو ہم دونوں ٹونز لیکن تم مجھے ہمیشہ یہ احساس دلاتے ہو کہ تم بڑے اور میں چھوٹی ہوں۔“ اس کی بات سنتا مومن ایک بار پھر ہنس دیا۔ ہنستے ہوئے اس کی آنکھیں چھوٹی ہو جایا کرتی تھیں۔

گاڑی کمال مینشن کے سامنے آکر رکی تو دروازے کے ساتھ بنے کین میں بیٹھے گارڈز نے اسے دیکھ کر ایک بٹن دبایا اور لوہے کے اونچے بڑے دروازے کھلتے چلے گئے۔ دور دور تک پھیلے سبزہ زار کے درمیان بنے لمبے ڈرائیو وے کے اختتام پہ اونچا بڑا خوبصورت سا ہلکے بھورے رنگ میں ڈوبا مینشن یہاں سے مزید خوبصورت دکھتا تھا۔ اسے دیکھ کر ایسے لگتا تھا جیسے کسی قدیم محل کو جدید طرز میں ڈھال کر تعمیر کیا گیا ہو۔

مومن نے گاڑی سیدھی داخلی دروازے سے سامنے کھڑی کی۔ لاریب مسکراتے ہوئے گاڑی سے باہر نکلی۔ دروازہ بند کر کے پلٹے ہی اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ پورچ میں اس کی اپنی گاڑی سمیت تین گاڑیاں کھڑی تھیں لیکن ان تینوں گاڑیوں کے ساتھ موجود مینا کی گاڑی کی جگہ خالی تھی۔ ماتھے پہ بل ڈالے اس نے گردن ادھر ادھر گھما کر بغور دیکھا مگر مینا کی گاڑی وہاں نہیں تھی۔

”پیٹر۔۔۔۔“ غصیلی آواز میں ملازم کو آواز دیتے اس کا بس نہیں چل رہا تھا کچھ کر ڈالے۔ ”پیٹر۔۔۔۔“

”کیا ہوا ہے؟“ اسے ایسے چلاتے دیکھ کر مومن فوراً گاڑی سے باہر نکلتا اس کی طرف آیا۔

”مینا کی گاڑی یہاں نہیں ہے۔ میں نے ان لوگوں کو کتنی بار کہا ہے مینا کی چیزوں کو مت چھیڑا کریں لیکن ان لوگوں کو سمجھ ہی نہیں آتی۔ پیٹر۔۔۔۔۔“ مومن کو جواب دیتے اس نے ایک بار پھر پیٹر کو آواز لگائی۔ پیٹر ہانپتا کانپتا پورچ میں آیا۔

”یس میم۔“ ڈرتے ڈرتے اس نے کہا۔ لاریب کو غصہ کم کم ہی آتا تھا لیکن جب آتا تھا تو پھر بہت شدید آتا تھا۔ اور یہ بات سارے ملازم بہت اچھے سے جانتے تھے کہ اسے غصہ صرف ایک ہی وجہ سے آیا کرتا تھا۔ اپنا اس کا بڑے سے بڑا نقصان ہو جائے وہ کچھ نہیں کہتی تھی لیکن مینا کی کوئی چیز ادھر سے ادھر ہو جائے تو پھر کسی کی خیر نہیں ہوتی تھی۔

”مینا کی گاڑی کہاں ہے؟ میں نے کتنی بار کہا ہے کہ اس کی چیزوں کو مت چھیڑا کرو۔“ غصے کے باعث اس کی آواز اونچی تھی اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”اچھا خیر ہے۔ کوئی بات نہیں ہو جاتا ہے۔“ مومن نے اسے رام کرنا چاہا مگر۔۔۔

”کیا مطلب خیر ہے۔ میں ہزار بار کہہ چکی ہوں اس کی چیزوں کو مت چھیڑا کرو مجھے اچھا نہیں لگتا لیکن ان لوگوں کو سمجھ ہی نہیں آتی۔“ مومن نے گہرا سانس لے کر سر جھکا کر ڈانٹ سننے پیڑ کو دیکھا۔

”گاڑی کہاں ہے؟“ اس نے پیڑ سے پوچھا۔

”سروہ گیراج میں کھڑی ہے۔ میم نے یہاں سے صفائی کا کہا تھا تو اس لیے اسے وہاں کھڑا کیا تھا۔ مگر صفائی کے بعد میں اسے یہاں پارک کرنا بھول گیا۔ آئی ایم ایکسٹریملی سوری میم نیکسٹ ٹائم ایسا نہیں ہو گا۔“ مومن کو جواب دیتے اس نے ساتھ ہی لاریب سے بھی کہا۔

”ممی کو سمجھا دو مومن کہ مینا کی چیزوں کو چھوڑ دیں۔“ وہ مومن کو ایک نظر دیکھ کر بولی پھر پیڑ کی طرف پلٹی۔ ”اور تم۔۔۔ یہ بات تم لوگ ہر بار کہتے ہو۔ اور ہر چند دن بعد پھر سے ایسا ہوتا ہے۔ دوبارہ ایسا ہوا تو میں بتا رہی ہوں تم یہاں کام نہیں کر سکو گے۔“ اپنے سابقہ انداز میں کہتی وہ بیگ اٹھائے تن فن کرتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔ مومن گہرا سانس لیتا پیڑ کو جانے کا کہتا خود بھی اندر کی طرف بڑھ گیا۔

اندر آ کر وہ تیز تیز قدموں سے چلتی سیدھا اوپری منزل پہ موجود اپنے کمرے میں آئی۔ دروازہ ٹھاہ کی آواز سے بند کرتے، بیگ ایک طرف رکھے صوفے پہ اچھالتے، فون بیڈ پہ پھینکتے وہ گرنے کے سے انداز میں بیڈ پہ لیٹ گئی ایسے کے پیر نیچے لٹک رہے تھے۔ مومن اس کے پیچھے نہیں آیا تھا۔ جانتا تھا وہ ابھی غصے میں ہے۔ اسے اکیلے رہنے کی ضرورت ہے۔

”آئی ہیٹ یو مینا۔ آئی ہیٹ یو۔“ غصے سے کہتے اس نے آنکھیں موند لیں۔ چند لمحے وہ ایسے ہی لیٹی رہی پھر آنکھیں کھول دیں۔ اب کے چہرے اور آنکھوں میں غصہ نہیں تھا۔ وہاں کچھ اور تھا۔

”تمہیں میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہاں غم تھا، کرب تھا، دکھ تھا، تکلیف تھی۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی کی تہہ لیے وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔ ”تمہیں مسئلہ ڈیڈ سے تھا تو ان تک ہی رکھتیں، مجھے کیوں چھوڑا؟“ ہلکی بھوری آنکھوں میں غم کا اک جہاں آباد تھا۔ ”تم واپس آؤ گی تو میں تم سے بالکل بات نہیں کروں گی۔“ چھت پہ نظریں مرکوز کیے وہ کہے گئی۔ ”ایسے کون کسی کے ساتھ کرتا ہے جیسا تم نے میرے ساتھ کیا؟“ شکایات کی ایک لمبی فہرست تھی لیکن سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اگلی کتنی ہی دیر وہ یو نہی لیٹی رہی، دھیرے دھیرے مینا سے شکایات کرتی رہی، دل کا غم آنسو کے ذریعے باہر نکالتی رہی۔ کچھ لوگوں کی موجودگی نعمت ہوتی ہے اور غیر موجودگی عذاب۔ مینا اس کے لیے وہی انسان تھی جس کا ہونا نعمت تھا اور نہ ہونا عذاب۔

آنکھیں ایک بار پھر بند کرنے سے پہلے اس نے ساتھ رکھا فون اٹھا کر سامنے کیا اور معاویہ کو ایک میسج لکھا۔ ”کل تم بلیک میں ہی آنا۔ مجھے کچھ کلر فل پینٹ نہیں کرنا۔“ سینڈ کرنے کے بعد اس نے فون سائلنٹ کر کے واپس رکھ دیا اور ایک بار پھر اپنے سابقہ مشغلے میں مشغول ہو گئی۔ اسے اس وقت کسی سے بات نہیں کرنی تھی۔ کسی کی آواز نہیں سننی تھی۔ بس ڈھیر سارا رونا تھا۔

☆☆☆☆☆

سان فرانسسکو میں اس وقت رات اتر رہی تھی۔ سردیوں کا آغاز تھا اس لیے رات میں خنکی سی ہو جایا کرتی تھی۔ احلام د میر کے اپارٹمنٹ میں آؤ تو وہ بدلتے موسم سے بے نیاز ڈھیلے سے سویٹر اور ٹراؤزور میں ملبوس اسٹڈی ٹیبل پہ بیٹھی لیپ ٹاپ پہ کام کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی اور ہلکی ہلکی ہوا اندر آرہی تھی۔ کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر دیکھو تو اسٹڈی ٹیبل پہ جابجا کاغذات بکھرے تھے جو کہ تازہ تازہ پرنٹ شدہ لگ رہے تھے۔ کچھ کاغذات پہ اسکی نوٹس بھی لگائے گئے تھے جن پہ چھوٹے الفاظ

میں کچھ لکھا گیا تھا۔ خود وہ لیپ ٹاپ کے ساتھ یو ایس بی لگائے وہ معلومات چیک کر رہی تھی جو نیکو نے اسے آج فراہم کی تھیں۔ آدھا گھنٹہ مزید وہ یہی سب کرتی رہی۔ کبھی لیپ ٹاپ کی اسکرین کو دیکھتی پھر ایک کاغذ اٹھا کر اس پہ اسکی نوٹ لگاتی، چند الفاظ لکھتی اور پھر واپس لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ بلا آخر جب اسے لگا کہ اب وہ ساری معلومات نوٹ کر چکی ہے تو لیپ ٹاپ بند کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر کاغذات پہ لگے اسکی نوٹس اتار کر سامنے بورڈ پہ اے والی تصویر کے نیچے لگائے اور کاغذات اکٹھے کر کے ترتیب سے فائل میں لگانے کے بعد اس نے بے اختیار ایک سکون بھر اسانس لیا۔ بے ترتیبی سے اسے عجیب سی الجھن ہوتی تھی۔ اپنے کام سے مطمئن ہو کر ایک آخری نظر سب چیزوں پہ ڈال کر وہ باہر کی طرف بڑھ گئی۔ اسے کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ عموماً وہ رات کے وقت کافی نہیں پیتی تھی لیکن کبھی کبھار جب ضرورت پڑتی تب پی لیا کرتی تھی۔ کافی بناتے ہوئے اس کا ذہن بھٹک بھٹک کر صبح دیکھے خواب کی طرف جا رہا تھا۔ پھر نیکو سے ملاقات، کرسٹی کی کال، اس کے میسجز، ان دونوں کا ایک ہی بات کرنا، اسے اس کے انتقام سے باز رہنے کی تلقین کرنا، وہ یہ سب نہیں سوچنا چاہتی تھی لیکن اس سب کو ذہن سے جھٹک بھی نہیں پار ہی تھی۔ چار سال اس نے انتظار کیا تھا۔ ایک ایک لمحہ اس نے خود کو یہ کہتے گزارا تھا کہ ایک دن وہ انتقام ضرور لے گی لیکن۔۔۔۔۔ جب وہ دن آگیا تھا تو جانے کیوں اس کا ذہن بار بار منفی رخ دکھا کر اسے باز رہنے کو کہہ رہا تھا۔

کافی بنا کر وہ واپس کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ مگ ہاتھ میں تھامے وہ قدم قدم چلتی کھڑکی کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ ویسے تو کمرے سے ملحقہ بالکونی بھی تھی مگر اسے کھڑکی میں کھڑے ہو کر شہر کا نظارہ زیادہ پسند آتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ رات کی تاریکی میں تاروں کی مانند جگمگ کرتے سان فرانسسکو کو نہیں

دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے مگ تھامے دوسرے کی انگلی مگ کی سطح پہ پھیرتے مگ سے نکلتی بھاپ کو دیکھ رہی تھی۔

”تمہارے ڈیڈ تم سے بہت محبت کرتے تھے۔“ ذہن کی سطح پہ ابھرتے ان الفاظ نے اس کی انگلی کی حرکت کو ایک دم ساکت کیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا پورا وجود ٹھہر سا گیا۔ ”تمہارے ڈیڈ تم سے بہت محبت کرتے تھے“ یہ وہ الفاظ تھے جنہوں نے چار سال اس کو آگ کی بھٹی میں جھونکے رکھا تھا۔ کافی کا مگ ایک ہاتھ میں تھامے اس نے دوسرے ہاتھ کو ٹراورز کی جیب میں ڈال کر کچھ باہر نکالا۔

”تمہارے ڈیڈ نے تمہارے پیدا ہونے کی خوشی میں یہ ڈائمنڈ رنگ بنوائی تھی۔“ وہ چھوٹی سی ہیرے کی انگوٹھی تھی جو اس کے باپ نے اس کے پیدا ہونے سے پہلے اس کے لیے بنوائی تھی۔ ہلکی سی مسکراہٹ لیے وہ اس انگوٹھی کو دیکھے گئی۔ اس کا باپ اس سے کتنا پیار کرتا تھا، اس کے پیدا ہونے پہ وہ کتنا خوش تھا۔ لیکن پھر۔۔۔ پھر کسی کو ان کی خوشی اس نہیں آئی۔ اس حسد نے، جلن نے سب تباہ کر دیا۔ محل کے اندر سے غداری کی جائے تو نقصان ہمیشہ بھاری ہوا کرتا ہے۔ اسے اور اس کے خاندان کو یہ بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ تباہی اور بربادی ان کا مقدر لکھ دی گئی تھی تو انہیں یہ قبول کرنا پڑا تھا۔ لیکن اب۔۔۔ اب وقت بدل گیا تھا۔ انتقام کی جس آگ میں وہ سالوں سے جل رہی تھی اس میں دوسروں کو جلانے کا وقت شروع ہو گیا تھا۔ کل کے شیر اب شیر نہیں رہے تھے۔ اگر نیکو اور کر سٹی کو لگتا تھا کہ وہ بیوقوفی کر رہی تھی، اپنے قد سے بڑے دشمن بنا رہی تھی تو لگتا رہے۔ انہوں نے وہ محسوس نہیں کیا تھا جو اس نے کیا تھا۔ انہوں نے وہ نہیں دیکھا تھا جو اس نے دیکھا تھا۔ وہ وہ نہیں جانتے تھے جو وہ جانتی تھی۔ وہ اس اذیت سے نہیں گزرے تھے جس سے وہ گزری تھی۔ انہوں نے زندگی کے کئی سال ویسے تڑپتے ہوئے نہیں گزارے تھے جیسے اس نے گزارے تھے۔ انہوں نے ویسا انتظار نہیں کیا تھا جیسے اس نے کیا تھا۔ انہوں نے ایک

ایک لمحہ انتقام اور صحیح وقت کے آنے کے انتظار میں نہیں گزارا تھا جیسے اس نے گزارا تھا۔ انہوں نے اپنے باپ سے ویسی محبت نہیں کی تھی جیسی اس نے کی تھی۔ اور بس۔۔۔۔۔ یہاں آکر ساری باتیں، ساری دلیلیں ختم ہو جایا کرتی تھیں۔ ہاتھ میں تھامی انگوٹھی کو دیکھتے وہ اس سب کو سوچے گئی۔

اور اس سب کی ایک کڑی معاویہ تبریز خان سے جا کر ملتی تھی۔ وہ وہ انسان تھا جس کی وجہ سے آج وہ یہاں تھی، اس حال میں، اس مقام پہ تھی۔ سالوں اس نے اسے بھلائے رکھا لیکن اب وقت آگیا تھا کہ وہ اس سے اپنا بدلہ لے۔ شروعات اگر اس کی وجہ سے ہوئی تھی تو اس کے انتقام کا آغاز بھی معاویہ تبریز خان کی بربادی سے ہی ہونا چاہیے تھا۔ کبھی جو وہ اس کی راہ کی رکاوٹ تھی تو اب معاویہ تبریز خان کو کامیابی کی بلندیوں پہ ہونا چاہیے تھا۔ اسے اس کے بارے میں معلومات چاہئیں تھیں جو کہ نیکو جلد ہی اسے فراہم کرنے والا تھا۔ معاویہ تبریز خان کا زمین پہ واپس آنے کا وقت ہو اچا ہوتا تھا۔

گہرا سانس لیتے اس نے وہ چھوٹی سی انگوٹھی احتیاط سے واپس جیب میں ڈالی پھر کافی کا ایک گھونٹ بھرا۔ کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ کبھی وہ ٹھنڈی کافی نہیں پیا کرتی تھی لیکن اب پی لیا کرتی تھی کیونکہ کبھی وہ بھی تو نہیں ہوا تھا جو اب ہوا تھا اور ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی کافی کے گھونٹ بھرتے وہ روشنیوں سے منور شہر کو دیکھے گئی۔ ہر منفی خیال کو ذہن سے جھٹکتے وہ انتقام کے عزم کو مزید پختہ کرتی گئی۔ ٹھنڈ مزید بڑھتی گئی، سان فرانسسکو میں رات مزید تاریک ہوتی گئی۔

☆☆☆☆☆

رات نے اپنے پر بیورلی ہلز پر بھی پھیلا دیئے تھے۔ بیورلی ہلز ایک پرسکون شہر تھا۔ یہاں رات میں مزید خاموشی ہو جایا کرتی تھی۔ کمال مینشن اس وقت رات کی تاریکی میں پوری شان و شوکت سے کھڑا تھا۔

میشن کے اندر باہر کی کئی بتیاں روشن کر دی گئی تھیں جو اس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر رہی تھیں۔ ہلکے بھورے رنگ کی عمارت زرد اور سفید روشنیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ آفتاب کمال کی رینج روور ابھی ابھی آکر پورچ میں رکی۔ شو فر کے دروازہ کھولنے پر وہ گاڑی سے نکلتا گھر کے داخلی دروازے کے سامنے موجود چند سیڑھیاں چڑھتا اوپر آیا۔ ایک لمحے کو ٹھہر کر گہرا سانس لیا۔ گارڈ کے دروازہ کھولنے پہ چند لمحے وہ کھلے دروازے کو دیکھتا رہا پھر اندر داخل ہو گیا۔ کبھی یہ گھر گھر ہوا کرتا تھا۔ اب یہ اس کے لیے گھر نہیں رہا تھا اور یہ بات وہ بخوبی جانتا تھا کہ اس چیز کا ذمہ دار وہ خود تھا۔ انسان اگر اپنی چیزیں اپنے ہاتھوں برباد کرے تو کسی دوسرے کو قصور وار نہیں ٹھہرا سکتا۔ زندگی کے اس مقام پہ اسے احساس ہوتا تھا کہ وہ لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں جن کے پاس الزام دینے کے لیے کوئی موجود ہوتا ہے۔ کم از کم وہ اس سے اپنا بدلہ تو لے سکتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ کیا کریں جو خود کو تباہی کے دہانے پہ خود لا کھڑا کریں؟ ایسے لوگوں کو اپنے اندر کی لعنت ملاست ساری زندگی سنی پڑتی ہے۔ وہ خود سے بدلہ بھی نہیں لے سکتے اور سزا کے طور پہ انھیں ساری زندگی خود کے ساتھ رہنا بھی پڑتا ہے۔ انسان دوسرے انسانوں سے جان چھڑا لیتا ہے، خود سے کیسے چھڑائے؟

BEING THE STRING OF YOUR KITE

اندر داخل ہوتے ہی اس نے ایک نظر دونوں اطراف میں موجود دیواروں پہ ڈالی جہاں بیشتر فریمز میں اس کے بچوں کی تصویریں لگی تھیں۔ یہ روز کا معمول تھا۔ صبح شام یہاں سے گزرتے وہ ان تصویروں کو بغور دیکھا کرتا تھا۔ ان تصویروں میں سب سے نمایاں تصویریں رنگ برنگے بالوں والی لڑکی کی تصویریں تھیں۔ وہ مینا تھی۔ کسی تصویر میں اس کے بال گہرے گلابی تھے، کسی میں گہرے نیلے، کسی میں سبز، کسی میں سنہرے تو کسی میں سرخ۔ اٹنے سیدھے کام کرنا اور بالوں کا رنگ بدلتے رہنا اس کے پسندیدہ کام تھے۔ وہ سر اٹھائے، اداس سی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے ایک ایک تصویر کو بغور دیکھے گیا۔ ملازم اس کا بیگ اور

کوٹ لے کر اندر اس کے کمرے کی طرف جا چکا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا چلتا ہوا اندر ہال کی طرف آیا۔ ہلکے اور گہرے بھورے رنگوں کے امتزاج سے سجے ہال کے دونوں اطراف سے گول چکر دار سیڑھیاں اوپر دوسری منزل کی طرف جاتی تھیں جن پہ گہرے بھورے رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔ دیواریں مختلف اقسام کی بیش قیمتی پینٹنگز اور نوادرات سے سजी تھیں۔ کھڑکیوں کے آگے بھاری پردے گرے تھے۔ سیڑھیوں کے عین اوپر درمیان میں بڑا سا خوبصورت فانوس لٹک رہا تھا جو اس وقت روشن تھا۔ کئی طرح کے ڈیکوریشن پیمز سجاوٹ کے طور پہ رکھے ہال کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ ہال کی تھیم میں سنہری، بھورا اور سیاہ رنگ شامل تھے اس لیے ہر چھوٹی بڑی چیز کو انھیں رنگوں کی مناسبت سے سجایا گیا تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ خوبصورتی اور نفاست سے سजी اپنے مالکین کے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیتی تھی۔ ہال کی بائیں طرف کی راہداری سے گزر کر آگے کمرے تھے جبکہ دائیں طرف ڈائننگ ایریا اور ڈرائنگ روم تھا۔ سیڑھیوں کے دوسری طرف سیننگ ایریا تھا اور اس کے ساتھ بیک یارڈ کی طرف کھلتا دروازہ تھا۔ وہ ہال کے بائیں طرف موجود اپنے کمرے کی طرف بڑھنے ہی لگا تھا کہ دفعتاً دائیں جانب سے آتی ہنسی کی آواز سن کر رک گیا۔ وہ لاریب کی آواز تھی۔ کتنے عرصے بعد اس نے لاریب کو ایسے ہنستے ہوئے سنا تھا اسے یاد بھی نہیں تھا۔ ایک نظر کلائی پہ بندھی گھڑی پہ ڈالی۔ یقیناً وہ لوگ اس وقت ڈائننگ روم میں ڈنر کر رہے تھے۔ ایک گہرا سانس لیتے وہ ڈائننگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہ جانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا اس کے جاتے ہی سب نے اٹھ جانا تھا مگر کچھ معاملات میں انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں وہ بھی بے اختیار تھا۔

اندر ڈائننگ روم میں آؤ تو ڈائننگ ٹیبل کی سربراہی کر سی خالی تھی۔ اس کے ایک طرف لاریب اور مومن بیٹھے تھے اور سامنے تہینہ پروقاہ انداز میں بیٹھی مسکراتے ہوئے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

پینتالیس اور پچاس کے درمیان کی عمر ہونے کے باوجود وہ اچھی خاصی فٹ اور ینگ لگتی تھی۔ اس کے ہر ہر انداز سے تمکنت جھلکتی تھی۔ چہرے اور آنکھوں میں نرمی سی گھلی ہوئی تھی۔ اس کا شمار ایسے لوگوں میں ہوتا تھا جن کے چہرے پہ ہمہ وقت نرم سی مسکراہٹ سجی رہتی تھی۔ لاریب ہو بہو اس کی کاپی لگتی تھی۔ وہی نین نقوش، وہی چہرہ، وہی آنکھیں، وہی بال، جو بھی انھیں دیکھتا ان کی اس قدر مماثلت پہ حیران رہ جاتا۔

دوپہر کے سارے معاملات سلجھ چکے تھے۔ مومن نے آکر تہینہ کو بتا دیا تھا کہ مینا کی کار اپنی جگہ پہ نہ ہونے کی وجہ سے لاریب غصے میں ہے اور اس کے بعد وہ اگلے دو گھنٹے کمرے میں بند رہی تھی۔ پھر تہینہ نے جا کر اسے منایا اور اس بات کی یقین دہانی کروائی کہ آئندہ ایسا نہیں ہو گا تب جا کر اس کا موڈ بحال ہوا تھا۔ باپ کی نسبت ماں کے ساتھ دونوں کے تعلقات اچھے تھے۔ لاریب قدرے حساس طبیعت کی مالک تھی اس لیے تہینہ اس کی بہت پرواہ کرتی تھی پھر مینا کے بعد سے تو وہ بھی اس کے قریب ہو گئی تھی۔ اس لیے مطلع صاف ہونے کے بعد وہ لوگ خوشگوار انداز میں باتیں کرتے ڈنر کر رہے تھے۔ مومن وقفے وقفے سے کچھ ایسا کہہ رہا تھا جس پہ لاریب بے ساختہ ہنس دیتی۔ تہینہ دونوں کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر خوش تھی۔

پاستا کانٹے میں پھنسا کر منہ میں ڈالتے، مومن کی کسی بات پہ ہنس کر سر جھٹکتے وہ سیدھی ہوئی ہی تھی کہ نظر سامنے دروازے کے پاس کھڑے الٹمش پر پڑی۔ ایک لمحہ۔۔۔ ایک لمحہ لگا تھا اور اس کے چہرے کی مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ چہرے کے سارے عضلات تن سے گئے تھے۔ تاثرات میں ایسی سختی، ایسی کڑواہٹ گھل گئی تھی کہ دروازے کے پاس کھڑے الٹمش کمال کو اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔

لاریب۔۔۔ اس کی بیٹی۔۔۔ اس سے اتنی نفرت کرتی تھی کہ اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس بات سے اچھے سے واقف تھا لیکن ہر بار خود کا سامنا ہونے پہ اس کے چہرے پہ در آنے والے تاثرات دیکھ کر تکلیف نئے سرے سے ہوتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اپنے بزنس کی وجہ سے اپنے بچوں کو وہ وقت نہیں دے سکا تھا جو ان کا حق تھا لیکن اب۔۔۔ اب جب اس کے پاس وقت تھا تو اس کی اولاد کو اس کے وقت کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ مومن اور مینادونوں نے اس چیز کا کبھی اتنا اثر نہیں لیا تھا، وہ دونوں ذرا لاپرواہ سی طبیعت کے مالک تھے مگر لاریب۔۔۔ وہ یہ بات بہت محسوس کرتی تھی مگر التمش کمال نے یہ جاننے میں بڑی دیر کر دی تھی۔ پھر اب تو اس کے کھاتے میں اور بھی بہت سے جرم شامل ہو گئے تھے۔ اب فاصلہ اتنا تھا کہ مٹانے کو یہ ایک زندگی ناکافی تھی۔

سر جھٹکتے، اپنے ذہن کو ہر منفی خیال سے آزاد کرتے، وہ نرم سی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے چلتا ہوا اندر آیا۔ اسے دیکھ کر مومن کا چہرہ بھی یک دم سپاٹ ہو گیا تھا۔ البتہ تہمینہ نے پرسکون انداز میں گردن موڑ کر مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

”ڈنر چل رہا ہے۔“ یہ سوال نہیں تھا۔ بات کا آغاز تھا۔ جس کا جواب الفاظ کی صورت میں نہیں آیا تھا۔ لاریب کا نٹاپلیٹ میں رکھتے، کرسی دھکیلتے اٹھ کھڑی ہوئی۔ التمش کمال کے ساتھ سے گزر کر دروازے کے طرف بڑھتے ہوئے اس نے ایک نگاہ غلط بھی اس پہ ڈالنا گوارا نہ کیا تھا۔ التمش کی مسکراہٹ ایک دم پھیکی پڑی۔ مومن بھی اس کے پیچھے فوراً اٹھا۔ ویسے تو اسے اپنے باپ کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر ابھی اسے لاریب سے کچھ بات کرنی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اب جو وہ دروازہ بند کرے گی تو پھر یہ دروازہ صبح سے پہلے نہیں کھلے گا۔ اس لیے وہ بھی فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

”لی بات سنو۔“ اس نے قدرے اونچی آواز میں کہا کیونکہ لاریب تیزی سے باہر نکلی تھی۔ ”معاویہ کی کال آئی تھی کہہ رہا تھا اسے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ اسے لازمی کال کر لینا۔“ دروازے سے باہر نکلتے مومن کے یہ الفاظ التمش اور تہمینہ دونوں نے بخوبی سنے تھے۔

”معاویہ؟“ تہمینہ پلٹ کر ان دونوں کو جاتا دیکھ رہی تھی جب التمش نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھتے پوچھا۔

”لاریب کا کلاس فیلو ہے۔ دونوں کوئی پراجیکٹ ساتھ کر رہے ہیں۔ آؤ بیٹھو، کھانا کھاؤ۔“ تہمینہ نے اپنے ازلی نرم انداز میں اس کی بات کا جواب دیتے اسے اس انداز میں کھانے کی دعوت دی جیسے کوئی رسماً گھتا ہو۔ ہاں البتہ چہرے پہ اب پہلے جیسی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اس کے آنے پہ بچوں کا اٹھ جانا عام سی بات تھی۔ اس لیے اس کا اس انداز میں پیش آنا بھی معمول کی بات تھی۔ التمش نے سر ہلایا پھر سربراہی کر سی کھینچتا بیٹھ گیا۔

”صرف کلاس فیلو ہے؟“ تہمینہ کے ہاتھ سے لڑانیہ کی ٹرے پکڑتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”مجھے زیادہ تو نہیں معلوم لیکن مومن کہتا ہے کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔ مومن بھی اس سے مل چکا ہے اچھا لڑکا ہے۔ اس کا اندازہ ہے کہ وہ بھی لاریب کو پسند کرتا ہے۔“ اس کے قدرے تفصیلی جواب پر التمش نے سر ہلایا اور تھوڑا سا لڑانیہ نکال کر اپنے سامنے رکھی پلیٹ میں ڈالا۔ تہمینہ واپس کھانے کی طرف متوجہ نہیں ہو سکی۔ دونوں ہاتھوں کو باہم ملا کر میز کی سطح پہ رکھتے وہ سنجیدگی سے اسے دیکھے گئی۔

”مینا کی بار میں لا علم تھی، پھر اس کا معاملہ تھوڑا مختلف ہے۔ مومن کی بار بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ان دونوں کے ساتھ تم نے جو بھی کیا ہم نے برداشت کر لیا مگر لاریب۔۔۔“ وہ ایک لمحے کور کی۔ ”مجھے چھوڑو مومن

بھی اسے لے کر بہت حساس ہے۔ اگر لاریب کے ساتھ تم نے کچھ بھی کیا تو وہ تمہیں نہیں چھوڑے گا۔
التمش۔ یاد رکھا کرو کہ اب وہ بڑا ہو گیا ہے اور یہ بھی کہ وہ تمہارا بیٹا ہے۔ پھر لاریب کی طبیعت سے بھی تم
باخوبی واقف ہو۔ اس لیے کچھ بھی کرتے ہوئے محتاط رہنا۔“ التمش نے لزانہ کی مدد سے منہ میں
رکتے ہوئے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا یوں جیسے وہ اس کی بات نہ کر رہی ہو، کوئی خبر نامہ پڑ کر سنار ہی
ہو۔

”کیا سب کچھ واپس پہلے جیسا نہیں ہو سکتا؟“ نظر اٹھا کر یاسیت سے اسے تکتے ہوئے کہا۔ تہینہ چند لمحے
اسے دیکھے گئی۔

”اگر مینا واپس آجائے تو شاید۔“ اس کا انداز سنجیدہ تھا۔

”وہ اپنی مرضی سے گئی ہے تم جانتی ہو۔“ واپس کھانے کی طرف متوجہ ہوتے آرام سے جواب دیا۔

”لیکن تمہاری وجہ سے گئی ہے یہ تمہیں جان لینا چاہیے۔ اور تم چاہو تو اسے ڈھونڈ کر واپس لاسکتے ہو۔“

تہینہ کا لہجہ اب کی بار سخت تھا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”ڈھونڈا انھیں جاتا ہے جو کھو جائیں۔ جو خود کو خود گم کر لیں وہ اپنی مرضی کے بغیر نہیں ملا کرتے۔“ اب

کے نظر اٹھا کر اسے دیکھ کر سنجیدگی سے باور کروایا۔

”یہ تم بھی جانتے ہو اور میں بھی کہ تم مینا کے بارے میں جانتے ہو۔ مجھے میری بیٹی واپس لا کر دو التمش

کیونکہ وہ تمہاری وجہ سے مجھ سے دور ہے۔ ہم سب سے دور ہے۔“ میز پر قدرے آگے کو جھک کر وہ چبا چبا

کر بولی۔ کچھ دیر پہلے والی سوبر، پروقار، ڈیسینٹ سی تہینہ اب کہیں نہیں تھی۔ وہ اس وقت صرف ایک

ماں تھی۔

”اگر اسے تم لوگوں کا اتنا ہی خیال ہوتا تو وہ فون پر رابطہ کر سکتی تھی۔ اس نے کبھی فون کیوں نہیں کیا؟“ یہ وہ سوال تھا جس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ یہ وہ بات تھی جہاں آکر وہ خاموش ہو جایا کرتی تھی۔ غصیلی نظروں سے اسے دیکھتے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تمہاری وجہ سے وہ یہاں سے گئی ہے اور تمہاری ہی وجہ سے اس نے ہم سب سے بھی تعلق توڑ لیا ہے۔ اور اب تمہاری ہی وجہ سے ہم سب ناچاہتے ہوئے بھی یہ سزا بھگت رہے ہیں۔“ ایک ایک لفظ توڑ توڑ کر ادا کرتی وہ غصے سے اسے دیکھتی چلی گئی۔

اس کے ڈائننگ روم سے نکلتے ہی التمش نے کانٹا واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔ کھانے کے دوران ملازمین کو اندر آنے کی اجازت نہیں تھی۔ کسی بھی چیز کے ضرورت پڑنے پر میز کے نیچے لگے بٹن کو دبا کر انھیں اندر بلا لیا جاتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس وقت یہاں کوئی ملازم نہیں تھا۔ تھکے تھکے سے انداز میں سر سیٹ کی پشت سے لگاتے وہ آنکھیں موند گیا۔

”تم میری وجہ سے ان کی نظروں سے اوجھل ہوئیں مینا۔ اب دیکھو۔۔۔ تمہاری وجہ سے میں ان کے سامنے ہوتے ہوئے بھی انھیں دکھتا ہی نہیں۔ تم تو مجھے بالکل ہی خالی ہاتھ کر گئیں یار۔ کسی کو تو میرا رہنے دیا ہوتا۔“ بند آنکھوں سے اس نے مدھم سی آواز میں سرگوشی کی۔ لہجہ ٹوٹے بکھرے کالج کی مانند تھا۔ وہ کچھ دیر ایسے ہی بیٹھا رہا۔ فلحال وہ تہمینہ کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ زندگی کا ایک اور دن گزر گیا تھا۔ ایک اور کرناک رات آن ٹھہری تھی۔ وہ اس سب سے بے نیاز بس چند لمحے سکون سے گزارنا چاہتا تھا۔ ڈائننگ روم میں اب کے کوئی آواز نہیں تھی۔ وہاں صرف خاموشی تھی۔ گہری، گھور، دبیز خاموشی نے چاروں اور اپنے پر پھیلا لیے تھے اور التمش کمال کو اپنے پروں میں پناہ دے دی تھی۔



فلانٹ لینڈ ہوئے چند گھنٹے بیت چکے تھے۔ عدن اپنی چھ لوگوں پر مشتمل ٹیم سے مل چکا تھا۔ نیوز ڈیپارٹمنٹ کا ڈائریکٹر ہونے کی وجہ سے ویسے تو اس پہ بہت ذمہ داریاں تھیں لیکن فلسطین اور وسطی مشرقی ممالک ایک ایسا پراجیکٹ تھا جس کی ایک ایک چیز کی خبر وہ خود رکھتا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ یہاں خود آیا تھا۔ (کسی بھی نیوز چینل میں دو بڑے ڈیپارٹمنٹ ہوتے ہیں۔ ایک سیلر ڈیپارٹمنٹ اور دوسرا نیوز ڈیپارٹمنٹ۔ نیوز ڈیپارٹمنٹ میں ہونے والے سارے کام مثلاً، رپورٹنگ، شوٹنگ، جرنلزم، ایڈیٹنگ، کانٹینٹ کری ایشن، پروڈکشن اور اس جیسے ہی دوسرے کام ڈائریکٹر کے اندر ہوتے ہیں)۔ یہاں پہنچ کر اس نے گھر اطلاع دے دی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی ان سب نے ڈنر کیا تھا اور پہلے سے طے شدہ شیڈول کے مطابق کل کے لیے کام ترتیب دینے کے بعد وہ لوگ ہوٹل میں موجود اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ اپنے سویٹ میں آنے کے بعد اس نے سب سے پہلے کافی کا آرڈر دیا کیونکہ کافی کے بغیر اس کی تھکن نہیں اتر کر رہتی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہی روم سروس بوائے اس کی کافی دے کر گیا تو وہ مگ تھامے بالکونی کا دروازہ کھول کر باہر نکلتا ریلنگ کے پاس آکھڑا ہوا۔

BEING THE STRING OF YOUR LIFE

موسم سرد تھا۔ رات کے وقت خنکی بڑھ جاتی تھی۔ نائٹ سوٹ پہ لانگ سا اور پہنے، دونوں کہنیاں ریلنگ پہ رکھے، ایک ہاتھ میں مگ تھامے وہ سامنے نظر آتے روشن شہر کو دیکھے گیا۔ بال ماتھے پہ گر رہے تھے اور چہرے پہ تھکن کے آثار نمایاں تھے۔ یہ تھکن سفر کی تھکن نہیں تھی۔ یہ وہ تھکن تھی جو سالوں سے اس کی ذات کا مستقل حصہ تھی۔ دن جیسے تیسے کاموں میں گزر جاتا تھا مگر رات۔۔۔۔۔ رات اذیت ناک ہوتی تھی پھر تب تو اور بھی تکلیف دہ ہوتی تھی جب وہ اسے خواب میں دیکھ لیتا تھا۔ وہ اسے بھلانے کی جتنی

مرضی کو شش کر لیتا دور اندر یہ بات وہ بہت اچھی طرح سے جانتا تھا کہ یہ کام اس کے لیے اس زندگی میں ممکن نہیں تھا۔ گھر اسانس لیتے اس نے کافی کا ایک گھونٹ بھرا۔

اسے می کو آج کے خواب کے بارے میں نہیں بتانا چاہیے تھا۔ یقیناً وہ پریشان ہو گئی ہوں گی۔ لیکن جس دن وہ اسے خواب میں دیکھتا تھا اس دن وہ اتنا خوش ہوتا تھا کہ اس کا دل چاہتا وہ ساری دنیا کو اپنی خوشی میں شامل کرے کیونکہ دور اندر وہ اسے خواب میں ہی سہی دیکھ لینے پر بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ لیکن یہ خوشی صرف چند لمحے کی ہوتی تھی، اس کے بعد ایک ناختم ہونے والی اذیت جنم لے لیتی تھی۔ وہ اسے بھولنا چاہتا تھا لیکن وہ اسے بھولنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اسے پالینا چاہتا تھا لیکن وہ ملنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ اسے ڈھونڈنا چاہتا تھا مگر وہ تو جیسے کہیں غائب ہی ہو گئی تھی۔ می پاپا کے سامنے اسے ٹھیک رہنا پڑتا تھا کیونکہ وہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی بات پہ بھی پریشان ہو جاتے تھے۔ پھر معاویہ کے رویے کی وجہ سے وہ پہلے ہی اتنے پریشان رہتے تھے کہ وہ انہیں اپنی وجہ سے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ماں باپ کی ذمہ داری کسی ایک بچے کے ذمہ نہیں ہوتی لیکن بعض اوقات ایک بچے کے ذمے آجایا کرتی ہے۔ کافی کے گھونٹ بھرتے اس کا ذہن مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

جس گھر میں وہ رہتی تھی اب وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ جس کالج میں جاتی تھی اب وہاں نہیں جاتی تھی۔ جن دوستوں سے ملتی تھی کوئی بھی اس کے بارے میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گئی۔ جن جگہوں پہ جاتی تھی وہ وہاں بھی اسے تلاش کر چکا تھا۔ جہاں اس کے ہونے کا ذرا سا بھی امکان تھا وہ وہاں جا کر بھی دیکھ چکا تھا مگر وہ نہیں تھی۔ وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ اب تو پچھلے دو سال سے اس نے اسے تلاش کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

پچھلے کئی سالوں سے اس نے خود کو کام میں غرق کر لیا تھا۔ خود کو اتنا مصروف کر لیا تھا کہ اس کا خیال اور اس کو یاد کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ ویک اینڈز تک میں وہ خود کو مصروف رکھتا تھا۔ کئی سالوں سے اس نے کوئی چھٹی نہیں کی تھی کیونکہ ایک بار چھٹیوں پہ جا کر واپس آنے پہ وہ اسے کھو چکا تھا۔ لیکن رات۔۔۔ رات کے لیے وہ کوئی مصروفیت نہیں ڈھونڈ سکا تھا۔ رات کے وقت اس کا خیال اسے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ وہ آخر گئی کہاں یہ وہ سوال تھا جو اسے پاگل کیے رکھتا تھا۔ ایک آہ اس کے لبوں سے خارج ہوئی۔ اس لمحے دل نے بڑی شدت سے اسے پکارا تھا۔

کچھ لوگ ہوا کے جھونکے کی مانند ہوتے ہیں۔ وہ بھی اس کی زندگی میں ہوا کے جھونکے کی مانند ہی آئی تھی۔ بس چند لمحے کھڑے کھڑے ٹھہری تھی۔ بیٹھ کر بات کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا تھا اور وہ ہوا کے جھونکے کی طرح آکر گزر بھی گئی تھی۔ پیچھے اسے وہیں ٹھہرا چھوڑ گئی تھی۔ اور وہ۔۔۔ وہ ابھی تک وہیں ٹھہرا ہوا تھا۔ کافی کا آخری گھونٹ بھرتے، ماتھے پہ آئے بال پیچھے کرتے وہ سیدھا ہوا اور ایک آخری نگاہ چاروں اور پھیلی روشنیوں پہ ڈالتے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ اسے سونا تھا کیونکہ صبح کاموں کی ایک لمبی فہرست تھی۔ اندر کی طرف بڑھتے عدن کو معلوم تھا کہ آج کی تاریخ میں سونا اس کے لیے مشکل امر ثابت ہونے والا تھا۔ رات دھیرے دھیرے مزید گہری ہو رہی تھی مگر اس کی اذیت۔۔۔ وہ ختم نہیں ہوئی تھی اور ہر بار کی طرح اس کا خیال آنے پہ مزید بڑھ گئی تھی۔ آج بھی ایسا ہی ہوا تھا کیونکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔

☆☆☆☆☆

کالج میں اس وقت بریک کا وقت تھا۔ وہ اپنی دوست کے ساتھ کالج کے گراؤنڈ میں بیٹھی چپس کے پیکٹ سے انصاف کرتے باتیں کر رہی تھی۔

”یار میں تمہیں سب سے اہم بات بتانا تو بھول ہی گئی۔“ ہدیٰ کے ساتھ بیٹھی نوال سر پہ ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ہدیٰ نے کولڈ ڈرنک کا ایک گھونٹ بھرتے بھنویں اچکا کر پوچھا ”کیا“۔

”کل میری وین تھوڑی لیٹ آئی تھی اس لیے تمہارے جانے کے بعد میں یہیں گر اوٹ میں ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے میم مصباح کو میم فرحت سے کہتے سنا کہ وہ نیکسٹ ویک اسپورٹس گالا کے بارے میں اناؤنس کریں گی۔ میں تو سن کر ہی اتنی خوش ہو گئی کہ چلو کچھ دن ان کتابوں سے تو جان چھوٹے گی۔ سوچا تھا گھر جا کر تمہیں بتاؤں گی پر میں بھول گئی۔“ نوال نے پر جوش انداز میں اسے بتاتے آخر میں بیچارگی سے اپنی توجیح پیش کی۔ جانتی تھی اسپورٹس گالا میں ہدیٰ کی جان بستی تھی۔

”کیا ہوا تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟“ اسے ویسے ہی سنجیدگی سے بیٹھے دیکھ کر نوال کو پوچھنا پڑا۔

”ایسی بات نہیں ہے بس میں سوچ رہی تھی کہ اس بار میں کسی بھی چیز میں حصہ نہیں لے پاؤں گی۔“ اس کے سنجیدگی سے کہنے پہ نوال کا منہ کی طرف جاتا ہاتھ ٹھہر گیا۔

”کیوں؟ میں نے تو کل کچھ سینئرز کو اور وین میں جانے والی لڑکیوں کو بھی بتا دیا۔ وہ سب بڑی پر جوش تھیں کہ تم کرکٹ میں پارٹ لو گی۔ ایک دو سینئرز لاسٹ ٹائم والی ٹیم سے بھی تھیں وہ بھی بہت خوش تھیں کہ تم ان کی ٹیم ہی جوائن کرو گی۔ اور کرکٹ تو تمہیں پسند بھی بہت ہے تو پھر اب کیا ہوا؟“ منہ میں چپس ڈال کر اس نے حیرت سے ہدیٰ کو دیکھتے پوچھا۔ اسے واقعی اس کے انکار کی وجہ سمجھ نہیں آئی تھی۔

”ہوا تو کچھ نہیں بس اس بار میرا کرکٹ کا موڈ نہیں ہے۔“ ہدیٰ نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔ نوال اس کی اچھی دوست تھی اور جانتی تھی کہ کرکٹ اسے بہت پسند تھا۔ میٹرک میں بھی دونوں ساتھ تھیں لیکن کچھ باتیں تھیں جو وہ اسے نہیں بتا سکتی تھیں۔

”بننا تو مجھے کر کٹر تھا لیکن اپنے گھر والوں کی مہربانی سے پڑھ میں پری انجینئرنگ رہی ہوں۔“ تلخی سے سوچتے وہ سر جھٹک کر رہ گئی۔ یہ بات امی اور بھائی دونوں بہت اچھے سے جانتے تھے کہ کرکٹ اسے کتنا پسند تھا اور یہ بھی کہ وہ کرکٹر بننا چاہتی تھی۔ لیکن جب بات کھلی اور انھیں معلوم ہوا کہ وہ اس چیز کو لے کر واقعی سنجیدہ ہے تو اسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا گیا کہ وہ لڑکی ہے اور لڑکیاں کرکٹ نہیں کھیلتیں اور بغیر اس کی کچھ سنے اس کا ایڈمیشن پری انجینئرنگ میں کر دیا گیا۔ اور بس تب سے امی اور بھائی سے اس کے تعلقات کشیدگی کا شکار تھے۔ امی نے اس کا ساتھ دینے کی بجائے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ خاندانی لڑکیوں کو زیب نہیں دیتا کہ وہ ایسے لڑکوں والے کھیل کھیلتی پھریں۔ پھر ان کے خاندان میں آج سے پہلے کبھی کسی نے ایسا کچھ کیا بھی نہیں تھا اس لیے اس کا ایسا کچھ سوچنا ہی احمقانہ خیال تھا۔ اس دن ہدیٰ نے ایسی خاندانی لڑکیوں پہ لعنت بھیجی تھی، بلکہ اس دن اس نے ساری دنیا پہ ہی لعنت بھیج دی تھی۔ تب سے اسے امی اور بھائی سے چڑسی ہو گئی تھی۔ ہر بات میں ان کی روک ٹوک پہ اسے سخت غصہ آتا تھا۔ تعلقات پہلے بھی کچھ خاص اچھے نہیں تھے مگر اس سب کے بعد مزید برے ہو گئے تھے۔

بچپن سے اس نے ایک ہی خواب دیکھا تھا اور وہ تھا کرکٹر بننا۔ بچپن میں وہ لڑکیوں کے ساتھ گڑیوں سے کھیلنے کی بجائے کالونی کے لڑکوں کے ساتھ مل کر کرکٹ کھیلتی رہتی تھی۔ کئی بار اسے اس بات پہ ڈانٹ بھی پڑی تھی مگر اثر اس نے کبھی نہیں لیا تھا۔ پھر بچپن میں رخسار بیگم نے بچپنا سمجھ کر اس چیز پہ کبھی اتنا غور بھی نہیں کیا۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ اس کا یہ شوق صرف شوق نہیں رہا تھا جنون بن گیا تھا مگر بات تب بگڑی جب میٹرک کے بعد اس نے یہ کہہ کر مزید پڑھنے سے انکار کر دیا کہ اسے پڑھائی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، اسے کرکٹر بننا ہے۔ میسم نے اس بات پہ بہت ہنگامہ کیا جس میں رخسار بیگم نے اس کا بھرپور ساتھ دیا اور ساری بات یہاں آ کر ختم ہو گئی کہ وہ ایک لڑکی ہے اور لڑکیاں کرکٹ نہیں کھیلتیں۔

لیکن کرکٹ کا شوق اس کے اندر سے ختم نہیں ہو سکا۔ یہی وجہ تھی کہ پچھلے سال یعنی پری انجینئرنگ کے پہلے سال کالج میں ہونے والے اسپورٹس گالا میں اس نے کرکٹ میں پارٹ لیا تھا اور اس کی بیٹنگ کی بدولت ہی اس کی ٹیم کی جیت ہوئی تھی۔

نوال اور وہ کئی سالوں سے ساتھ تھیں۔ وہ اس کے کرکٹ کے شوق کے بارے میں جانتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ وہ کرکٹر بننا چاہتی تھی مگر ہدیٰ نے کبھی اس سے اپنے گھروالوں کے بارے میں ڈسکس نہیں کیا تھا۔ ہاں اتنا ضرور بتا رکھا تھا کہ کچھ چیزوں کو لے کر اس کے گھروالے تھوڑے سخت تھے یہی وجہ تھی کہ وہ کرکٹر نہیں بن سکی تھی۔ دونوں کی دوستی اچھی اور گہری تھی لیکن اس میں بھی ایک حد قائم تھی اور اس حد کا احترام دونوں کی طرف سے ہمیشہ کیا گیا تھا۔

”کہاں کھو گئیں؟“ نوال کی آواز اسے خیالوں کی دنیا سے باہر لائی۔ وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”تمہیں ایک مزے کی بات بتاتی ہوں۔“ نوال کے کہنے پہ وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”تمہیں پتا ہے میرے گھر کے پاس ایک کراٹے اکیڈمی کھل رہی ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ لڑکیوں کے لیے الگ سے فیملی انسٹرکٹر ہوگی۔“ نوال کے بتانے پہ اس کے چہرے پہ خوشگوار سی حیرت در آئی۔

”سچ کہہ رہی ہو؟“ اسے جیسے یقین نہیں آیا تھا۔

”ارے بابا بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ بھائی کے جاننے والے ہیں جو اکیڈمی کھول رہے ہیں۔ کل رات بھائی نے بتایا تو مجھے تمہارا خیال آیا کہ جب ہم ٹینتھ میں تھے تب ایک بار تم نے کہا تھا کہ تمہیں کراٹے سیکھنے کا

بہت شوق ہے۔ اس لیے میں نے سوچا تمہیں بتادوں۔“ نوال ہاتھ جھاڑتے چپس کے خالی پیکٹ کو چڑھ کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔

”نوال۔۔۔۔۔ میرا دل چاہ رہا ہے تمہارا ماتھا چوم لوں۔“ وہ نوال کو کندھوں سے پکڑ کر ہلاتے ہوئے پر جوش سے انداز میں بولی۔

”ارے لڑکی حوصلہ رکھو۔ اس عمر میں کیا میری ہڈیاں توڑنی ہیں۔ پوری طرح ہلا کر رکھ دیا ہے۔ چھوڑو بھی۔“ نوال اس کی خوشی سے بے نیاز جھنجھلا کر کہتی خود کو چھڑوانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہدیٰ کابس نہیں چل رہا تھا خوشی سے گول گول گھومنے لگ جائے۔ کرکٹ کے بعد اگر اسے کسی چیز کا شوق تھا تو وہ کراٹے تھے۔ امی اس کے عادات و اطوار کے بارے میں اکثر کہتی تھیں کہ اس میں لڑکیوں والی کوئی خاصیت نہیں تھی۔ اس کے سارے شوق لڑکوں والے تھے۔ کرکٹ اور کراٹے دونوں کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کے ذہن نے تصدیق کی کہ امی کسی حد تک ٹھیک کہتی ہیں۔ کراٹے تو وہ سیکھے گی، لیکن کیسے؟ یہ سوال اہم تھا۔ گھر میں بتانے پر ایک بار پھر ناں ہونی تھی اتنا اسے پتا تھا اس لیے اسے کسی کو بھی بتائے بغیر یہ کرنا تھا۔ دل و دماغ میں بس ایک ہی جملے کی بازگشت تھی ”میں وہ کام ضرور کرتی ہوں جس سے مجھے یہ کہہ کر منع کیا جائے کہ میں ایک لڑکی ہوں۔“ پر سوچ انداز میں آنکھیں چھوٹی کیے اس کا ذہن مسلسل جمع تفریق کر رہا تھا کہ ایک دم سے ذہن میں جھماکہ سا ہوا۔ اس نے آنکھیں چھوٹی کیے نوال کو دیکھا۔ نوال جانتی تھی کہ اس کی فیملی سخت تھی اس لیے وہ اس کی تھوڑی بہت مدد کر سکتی تھی۔ ایک پرسکون سی سانس خارج کرتے، اپنے ارادوں کو مضبوط کرتے، بیگ کندھے پہ ڈالتے، خالی کولڈ ڈرنک کی بوتل اور مڑاٹرا چپس کا پیکٹ اٹھاتے وہ اٹھ کھڑی ہوئی کہ بیل ہو رہی تھی۔ بریک ختم ہو گئی تھی۔ اندر کلاس کی طرف جاتے ہوئے بھی اس کا ذہن مسلسل اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔



رات کی سیاہی پوری طرح سے چاروں اور اپنے پنچے گاڑھے بیٹھی تھی۔ لیکن چاند کی روشنی اسے پوری طرح سے راج کرنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔ ہلکی ہلکی چلتی ہوا میں پورے چاند کی پھیلی روشنی رات کی تاریکی کو کم کرنے میں پوری طرح مصروف دکھائی دیتی تھی۔ کمال مینشن میں آؤ تورات کی مناسبت سے چند ایک مدہم بتیوں کے علاوہ ساری بتیاں بجادی گئی تھیں۔ اس مدہم روشنی میں لاریب کمال آہستگی سے اپنے کمرے سے نکلتی دھیرے دھیرے چلتی سیڑھیاں اترتی دکھائی دے رہی تھی۔ موسم میں خنکی کے باعث نائٹ سوٹ کے اوپر ویلیوٹ کالانگ اور پہن کر اسے سامنے سے گرہ لگا رکھی تھی، پیروں میں نرم گرم سے جوتے موجود تھے۔ بال البتہ کھلے تھے۔ سیڑھیاں اترتے اس نے ایک نگاہ ارد گرد ڈالی۔ شاید سب سوچکے تھے۔ وہ سیڑھیوں کے دوسری طرف موجود سیٹنگ ایریا سے ہوتی بیک یارڈ کا دروازہ دھکیلتی باہر چلی آئی۔

باہر آتے ہی اس نے بے اختیار ایک گہرا سانس لیا۔ اندر اسے عجیب سی گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ بیک یارڈ میں اس وقت کوئی لائٹ نہیں جل رہی تھی۔ دور مینشن کے سامنے والے حصے میں شاید کوئی بلب جل رہا تھا لیکن اس کی روشنی اس جانب نہیں آرہی تھی۔ بیک یارڈ میں اندھیرے کومات دیتی واحد روشنی چاند کی تھی۔ وہ قدم قدم چلتی پول کی طرف بڑھ گئی۔ پول کے پانی میں چاند کا عکس نمایاں تھا۔ وہ جوتے اتارتی ٹراؤزر فولڈ کر کے اوپر کرتی پیر پانی میں ڈال کر بیٹھ گئی۔ ایک عجیب سی راحت کا احساس تھا جو اسے یوں پیر پانی میں ڈال کر ملتا تھا۔ وہ جب بھی اداس ہوتی، یا کسی بھی منفی جذبے کا شکار ہوتی یوں ہی پیر پانی میں ڈال کر بیٹھ جاتی۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے پانی اس کے اندر کے سارے منفی احساسات کو اپنے اندر سمولیتا ہو۔

آرٹسٹس کے لیے چیزوں کے معنی عام لوگوں سے مختلف ہوا کرتے ہیں۔ اس کے لیے پانی منفی رنگ کو اپنے اندر جذب کر لینے کی علامت تھا۔

وہ پانی کی سطح پہ نظر آتے چاند کے عکس کو اداسی سے دیکھ گئی۔ ذہن میں آج دن بھر کے واقعات ایک کے بعد ایک چلتے رہے۔ آج کل اسے مینا عام دنوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی یاد آرہی تھی۔ اور وجہ یہ تھی کہ کل اس کا برتھ ڈے تھا۔ وہ اپنے برتھ ڈے پہ اتنا خوش نہیں ہوتی تھی جتنا اس کے خاص دن پہ ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب۔۔۔ اب اس گھر میں مینا کے نام کا کیک نہیں کٹا کرتا تھا۔ یہ دن کمال مینشن کے مکینوں کے لیے سوگ کا دن قرار دے دیا گیا تھا۔ اس دن ہر کوئی دوسرے سے نظریں چرائے پھر تا تھا۔

ہلکی ہلکی چلتی ہوا سے اس کے بال اڑ کر آگے کی طرف گر رہے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر انھیں سمیٹتے کانوں کے پیچھے اڑسا۔ ذہن کی روایک بار پھر بھٹک کر مینا پہ آٹھری۔ مینا اس کی زندگی کا وہ انسان تھی جو اسے سب سے زیادہ عزیز تھی۔ بچپن سے اس نے اپنے ارد گرد اپنے ماں باپ کو اتنا نہیں دیکھا تھا جتنا مینا کو دیکھا تھا۔ ڈیڈ ہمیشہ مصروف ہوتے تھے۔ دن میں ایک بار یا کبھی ایک بار بھی انھیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا کرتا تھا لیکن پھر بھی اسے ان سے محبت تھی کیونکہ وہ اس کے ڈیڈ تھے۔ مئی انھیں وقت دیتی تھیں لیکن انھیں بھی بہت سی سوشل گید رنگز، چیریٹی ایونٹس اور اپنی دوستوں کی کٹی پارٹیز اٹینڈ کرنی پڑتی رہتی تھیں۔ اس لیے زیادہ تر وقت وہ لوگ نینی کے ساتھ ہی ہوتے تھے۔ پھر جب جب وہ والدین کی غیر

موجودگی پہ اداس ہوتی مینا ہمیشہ اسے سنبھال لیا کرتی۔ ڈیڈ اس کے اسکول کے ایونٹس میں باقی بچوں کے پیرنٹس کی طرح کبھی نہیں آتے تھے، ہمیشہ مئی کو اکیلے آنا پڑتا۔ اس بات پہ جب جب وہ روتی مینا اسے چپ کروایا کرتی۔ ہر سال گرمیوں اور سردیوں کی چھٹیوں پہ اس کے کلاس فیلوز اپنے پیرنٹس کے ساتھ

دوسرے ملکوں کی سیر پہ جاتے تھے۔ وہ بھی پیرنٹس کے ساتھ جانا چاہتی تھی لیکن انھیں ہمیشہ مئی کے ساتھ جانا پڑتا تھا کیونکہ ڈیڈ کے پاس کبھی بھی اس قسم کی فیملی ٹریپس کے لیے وقت نہیں ہوتا تھا۔

وہ کتنی بھی دکھی اور اداس ہوتی، کسی بھی چیز کو لے کر پریشان ہوتی اس نے کبھی مئی اور ڈیڈ سے شکایت نہیں کی تھی۔ وہ ہمیشہ مینا کے پاس جایا کرتی تھی کیونکہ ہمیشہ مینا نے ہی اسے سنا تھا، اسے سمجھا تھا، اسے سمجھایا تھا، اسے سکھایا تھا۔ مینا ہمیشہ کہتی تھی کہ وہ لوگ بڑی ہیں اور ان کی انھیں مصروفیات کی وجہ سے وہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے ہمیشہ موجود رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ماں باپ کی نسبت مینا کے زیادہ قریب تھی۔ مگر پھر بڑے ہوتے ہوتے وہ سن بھل گئی، بہت سی چیزیں سمجھ گئی لیکن اس کے اندر کی حساسیت۔۔۔ وہ کسی طور کم نہ ہوئی تھی بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی تھی۔

مینا نے اس کی زندگی کے کئی خانے ایک ساتھ پر کیے تھے اسی لیے وہ اس کی زندگی کا سب سے اہم جز تھی لیکن ساری بات تب بگڑی جب مینا یہاں سے چلی گئی۔ اور وجہ۔۔۔ وجہ اس کے سکے ڈیڈ تھے۔ اس دن اسے معلوم ہوا تھا کہ مینا اس کے لیے کیا تھی۔ اس دن اس نے خود کو واقعی تنہا محسوس کیا تھا۔ اس نے کبھی دوست نہیں بنائے تھے۔ اسے لوگوں سے گھلنا مانا، باتیں کرنا نہیں آتا تھا پھر مینا کے ہوتے کبھی اس چیز کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ اس کے ہوتے اسے کبھی اکیلے پن کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی تھی، ہمیشہ اس کے لیے موجود رہتی تھی۔ جب وہ چلی گئی تب زندگی میں پہلی بار اسے لگا تھا جیسے خدا نخواستہ اس کے ماں باپ مر گئے ہوں کیونکہ اس کے لیے ان دونوں کا کردار مینا نے ہی ادا کیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد وہ کتنے ہی دن روتی رہی تھی۔ کتنے دن اسے سمجھ ہی نہیں آئی تھی اب وہ کیا کرے گی۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنے اتنے حساس ہونے سے چڑھوئی تھی۔ اس چیز سے سن بھلنے میں اسے کئی مہینے لگ گئے تھے اور جب بلا آخر اس نے اس حقیقت کو قبول کر لیا کہ اب مینا اس کی زندگی میں موجود

نہیں رہی تو اس نے اس چیز کی وجہ کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ مینا یہاں سے کیوں گئی؟ یہ وہ سوال تھا جو وہ دن رات سوچتی رہتی اور پھر ایک دن وہ اس نتیجے پر پہنچ ہی گئی کہ مینا اسے اور اس گھر کو چھوڑ کر اس لیے گئی کیونکہ التمش کمال نے یعنی اس کے باپ نے مینا کو قصور وار ٹھہرایا تھا۔ اگر مینا کہہ رہی تھی کہ اس نے ایسا کچھ نہیں کیا تو وہ سچ کہہ رہی تھی۔ مینا جھوٹ نہیں بولتی تھی۔ التمش کمال اس کی بہن کے بارے میں غلط سوچتا تھا اور غلط کہتا تھا۔ مینا ایسی تھی ہی نہیں۔ ساری دنیا بھی کھڑی ہو کر کہتی کہ مینا نے یہ کیا تھا وہ تب بھی یقین نہ کرتی۔ مینا ایسا کچھ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ ساری دنیا غلط کہتی تھی۔

جس دن اس نے مینا کے جانے کی وجہ التمش کمال کو سمجھا اس دن زندگی میں پہلی بار گھر والوں نے اس کا غصہ دیکھا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر التمش کے سامنے کھڑی اسے مینا کے جانے کا الزام دیتی اس پہ چیختی چلاتی رہی تھی۔ التمش شاک کے عالم میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ تہمینہ اور مومن الگ حیران کھڑے تھے۔ انھوں نے آج سے پہلے کبھی لاریب کو ایسے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ اسے غصہ آتا ہی نہیں تھا اور اگر آتا بھی تھا تو اس نے کبھی اس طرح اظہار نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ نرم انداز میں بات کرتی تھی۔ دھیمی سی مسکراہٹ ہمہ وقت اس کے چہرے پہ رہتی تھی۔ لیکن اس دن۔۔۔ اس دن بہت کچھ بھول گیا تھا، بہت کچھ بدل گیا تھا۔ کچھ یاد رہا تھا تو وہ تھی مینا۔

مینا ان کے لیے بھی اہم تھی لیکن یہ بات سب بہت اچھے سے جانتے تھے کہ جو وہ لاریب کے لیے تھی وہ وہ کسی اور کے لیے نہیں ہو سکتی تھی۔ اس دن کے بعد سے اس کا رویہ التمش کمال کے لیے بدل گیا تھا۔ وہ تھایا نہیں اس کے لیے غیر اہم ہو گیا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کے اندر بس دو ہی احساسات ابھرتے تھے، غصہ اور نفرت۔ اس کے علاوہ اسے التمش کے لیے اور کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس کا باپ تھا یہ بات اسے بھول گئی تھی۔

اس دن کے بعد سے تہینہ اور مومن کے رویے میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ التمش پہ انہیں پہلے بھی غصہ تھا لیکن اب وہ اس سے مزید کھنچے کھنچے سے رہنے لگے تھے اور لاریب کو لے کر دونوں پہلے سے کئی گنا زیادہ حساس ہو گئے تھے مگر اس کے باوجود وہ یہ بات اچھے سے جانتے تھے کہ جو مقام اس کی زندگی میں مینا کا تھا وہ کسی دوسرے انسان کا مر کے بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ جو پہلے اپنی ہر بات مینا سے شیر کیا کرتی تھی اب کچھ بھی ہونے پہ خود کو کمرے میں بند کر لیتی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ اکیلے رہنا سیکھ گئی تھی۔ دل کی بہت سی باتیں اب کسی سے کہا نہیں کرتی تھی، انہیں اپنے تک رکھنا سیکھ گئی تھی کیونکہ دنیا کا کوئی بھی انسان اس کے لیے مینا نہیں ہو سکتا تھا۔ ہاں مئی اور مومن اچھے تھے، اس کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن وہ مینا نہیں تھے۔

مینا کے جانے کے بعد وہ جب جب اس کے بارے میں سوچتی اسے ایک چیز کا احساس شدت سے ہوتا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ ہر بچے کی طرح مینا کو بھی اپنے والدین سے محبت تھی اور شاید اس سے کئی گنا زیادہ تھی جتنی لاریب سمجھتی تھی کہ خود اسے اپنے والدین سے تھی۔ لیکن مینا نے کبھی اسے یا گھر کے کسی اور فرد کو اس چیز کی بھنک نہیں پڑنے دی تھی۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ خاموشی سے بغیر کہے اپنے بہن بھائیوں کے لیے ہمیشہ موجود رہی تھی۔ اور شاید یہی وجہ تھی کہ اسے التمش کمال کی باتوں سے اس قدر تکلیف پہنچی تھی کہ اس نے یہاں سے جانے کو ترجیح دی تھی۔

ایک عرصہ اس سب سے لڑنے کے بعد تین سال پہلے اس نے ایک آرٹ کالج میں ایڈمیشن لے لیا۔ اور تب۔۔۔ معاویہ اس کی زندگی میں چلا آیا۔ دونوں ایک پراجیکٹ کے لیے پارٹنر بنے تھے اور پھر کچھ ہی عرصے میں دونوں میں اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔ دوستی کے کچھ عرصے بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ دوستی اب صرف دوستی نہیں رہی تھی۔ وہ معاویہ کو پسند کرنے لگی تھی اور معاویہ کے انداز و اطوار بھی

اسے کچھ ایسا ہی بتاتے تھے۔ پھر معاویہ بھی اسی کی طرح حساس اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا انسان تھا۔ دونوں کی آپس میں اچھی جہتی تھی۔ اسے لگتا تھا وہ کم بولتی تھی لیکن معاویہ سے ملنے کے بعد پتا چلا تھا کہ وہ اس سے بھی کم بولتا تھا۔ وہ اچھا انسان تھا اور جب وہ اس کے ساتھ ہوتی تھی تو اسے اچھا محسوس ہوتا تھا۔ دل کی باتیں تو وہ اب بھی کسی سے نہیں کیا کرتی تھی ہاں اپنی زندگی میں معاویہ کو جگہ ضرور دے دی تھی۔ زندگی میں موجود ایک اہم انسان کھونے کے بعد کسی دوسرے انسان پہ کھلنے اور بھروسہ کرنے میں وقت لگتا ہے، اسے بھی لگتا تھا۔

ایک گھر اسانس لیتے اس نے سر جھٹک کر خود کو ہر سوچ، ہر خیال سے آزاد کرنا چاہا۔ اسے مینا کے بارے میں مزید نہیں سوچنا تھا۔ اس کی یاد تکلیف دیتی تھی۔ جانے سے پہلے اس نے لاریب کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ یہ تکلیف ہر تکلیف پہ بھاری تھی۔ ایک لمبا عرصہ وہ شکایات کی ایک نہ ختم ہونے والی فہرست بناتی رہی کہ جب مینا آئے گی تب وہ اس سے یہ کہے گی وہ کہے گی۔ اب اس نے یہ کہنا چھوڑ دیا تھا۔ اب بس وہ یہ سوچا کرتی تھی کیا مینا کبھی واپس آئے گی؟

ہلکی ہلکی ہوا ہنوز چل رہی تھی، چاند کی چاندنی یو نہی چاروں اور پھیلی ہوئی تھی۔ اس ہلکی ہلکی چلتی ہوا کو، چاند کی چاندنی کو، خاموش بیٹھی پانی کو تکتی لاریب کر چھوڑ کر بیک یارڈ کے دروازے سے اندر آؤ تو دروازے کی اوٹ میں دیوار کے ساتھ کوئی ہیولا سا کھڑا دکھتا تھا۔ قریب جا کر غور کرو تو وہ ہیولا التمش کمال سے ملتا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر سے یہاں کھڑا لاریب کو دیکھ رہا تھا کیونکہ اس کے سامنے بیٹھ کر اسے دیکھنے کا حق وہ کھو چکا تھا۔ وہ ڈاننگ روم میں ہی بیٹھا تھا جب کھٹکے کی آواز سن کر اس طرف آیا اور لاریب کو یوں بیٹھا دیکھ کر وہیں کھڑا اسے دیکھے گیا۔ آنکھوں میں اداسی کا ایک جہاں آباد تھا۔ وہ اس کی بیٹی تھی اور اسے اس سے بہت محبت تھی مگر اس محبت کو جتانے کا، بتانے کا اب وقت نہیں رہا تھا۔ اب کوئی فائدہ ہی نہیں تھا۔ وہ

اپنے ہاتھوں سب ختم کر چکا تھا۔ پھیکی سی نرم مسکراہٹ چہرے پہ سجائے وہ چاند کی روشنی میں بیٹھی لاریب کو دیکھے گیا۔ دل و دماغ میں بس ایک ہی سوچ تھی ”میںا کے ساتھ میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ مومن کو بھی میں نے بس بچانا چاہا تھا۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں تمہارے ساتھ کبھی کچھ غلط نہیں ہونے دوں گا۔“ وہ جانتا تھا ان میں سے کوئی اس پہ یقین نہیں کرتا تھا۔ سب اسے ہی قصور وار سمجھتے تھے لیکن کوئی بات نہیں۔ کبھی تو وقت اسے صحیح ثابت کر ہی دے گا۔ کبھی تو وہ اسے ٹھیک سمجھیں گے۔ ہاں بس یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ وقت اس کی زندگی میں آنا تھا یا موت کے بعد۔ وہ اداسی سے لاریب کو دیکھتے سوچتا رہا۔ اس وقت التمش کمال نہیں جانتا تھا کہ اس کے لیے یہ وقت کبھی نہیں آنا تھا۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ وقت کبھی نہیں آیا کرتا۔ التمش کمال کا شمار بھی انھیں لوگوں میں ہوتا تھا جن کے لیے وقت پلٹتا ہے تو پھر واپس آنا بھول جاتا ہے۔

Safar-e-Adab

☆☆☆☆☆

نئی صبح کا سورج طلوع ہوئے کافی دیر بیت چکی تھی۔ آسمان پہ چاروں اور بادلوں کا راج تھا اس لیے سورج اپنی جھلک دکھانے سے قاصر تھا۔ موسم کل کی نسبت زیادہ سرد معلوم ہوتا تھا۔ احلام دمیر کے اپارٹمنٹ میں آؤ تو وہ جلدی جلدی کافی کے گھونٹ بھرتی یونی جانے کے لیے تیار ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بی بی اے کی اسٹوڈنٹ تھی اور بس آخری دو سمسٹر رہتے تھے۔ کل نیکو سے ملنا ضروری تھی اس لیے وہ کلاس مس کر کے اس سے ملنے چلی گئی تھی لیکن آج کی کلاس بہت اہم تھی، وہ کسی بھی قیمت پر مس نہیں کر سکتی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ لیٹ ہو گئی تھی۔ کافی کا خالی مگ ایک طرف رکھتے وہ بیگ، فون اور چابیاں اٹھاتی باہر کی طرف بڑھ گئی۔ اپارٹمنٹ کو لاک کرتے وہ لفٹ کی مدد سے نیچے پارکنگ میں موجود اپنی ہونڈا سوک کی طرف بڑھی۔ اس گاڑی کو دیکھ کر ہر بار کی طرح اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اسے یاد تھا اسے

لے کر وہ کتنی خوش تھی لیکن اس کی یہ خوشی صرف چند دن ہی رہی تھی۔ اس گاڑی کی رجسٹریشن کی بدولت اس کے دشمن اسے ٹریس کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اور تب سے دو بندے اس کا پیچھا کرتے ہوئے پائے گئے تھے۔ کئی بار اس نے سوچا کہ وہ اس گاڑی کو بیچ کر بغیر رجسٹریشن کے کوئی گاڑی لے کر ان لوگوں کو چکما دے کر یہاں سے غائب ہو جائے لیکن پھر۔۔۔۔۔ ہر بار وہ اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیتی کہ ایسے وہ لوگ سمجھیں گے وہ ان خوفزدہ ہے۔ جبکہ وہ ان سے خوفزدہ ہر گز نہیں تھی یہی وجہ تھی کہ وہ اب تک یہاں موجود تھی لیکن گاڑی کو دیکھ کر ہر بار اسے یہ بات ضرور یاد آتی تھی۔

یونی پہنچ کر اس نے گاڑی پارکنگ میں کھڑی کی اور بیگ ایک طرف کندھے پہ ڈالتے اندر کی طرف بڑھ گئی۔ گھر سے باہر وہ کہیں بھی ہوتی اس کا انداز بے حد چوکنا اور محتاط ہوتا تھا۔ کئی جگہوں پہ وہ خنجر ساتھ لے کر گھومتی تھی لیکن یونی وہ اسے کبھی نہیں لائی تھی۔ یہاں لانا خطرناک ہو سکتا تھا۔ سرمئی آنکھوں کو معمول کے انداز میں ارد گرد گھماتے وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ سپید رنگ چہرے پہ سنجیدہ سے تاثرات رقم تھے اور دنیا جہان سے بے نیازی اور بیزاری چھائی ہوئی تھی۔ سیاہ بال ہمیشہ کی طرح اونچی پونی میں بندھے تھے۔ سفید سویٹر کے ساتھ لانگ جیکٹ اور سفید ہی اسٹیکرز پہنے تھے اور جیکٹ کی زپ کھول رکھی تھی۔

ایک ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈالے، دوسرے کو پہلو میں گرائے، بے نیازی سے گردن اٹھائے وہ یوں چل رہی تھی جیسے یونی اس کے باپ کی ذاتی جاگیر ہو۔ ہمیشہ کی طرح وہ جہاں جہاں سے گزر رہی تھی لوگ گردنیں موڑ کر اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس سب سے بے نیاز چلتی رہی کیونکہ اسے معلوم تھا پلٹ کر دیکھنے پہ وہ فوراً چہرہ پھیر لیں گے۔ اس کے دیکھنے کا انداز اور آنکھوں کا تاثر ایسا تھا کہ کوئی اس کے قریب آنے کی ہمت کم ہی کرتا تھا۔ اس کے دیکھنے کا یہ انداز یونی میں ”ڈی تھ لک“ کے نام سے مشہور تھا۔ پھر

چہرے پہ ”سٹے آوے فرام می“ بڑے صاف اور واضح انداز میں لکھا نظر آتا تھا کہ کوئی پاس آنے کی غلطی کرتا ہی نہیں تھا۔

پچھلے تین سالوں سے یہاں آنے پہ آج تک کبھی کسی نے اس کے چہرے کے سنجیدہ تاثرات میں دراڑ پڑتے نہیں دیکھی تھی۔ وہ چہرے اور آنکھوں میں سنجیدگی اور سرد سے تاثرات ایسے سجائے رکھتی تھی جیسے ہنسنا گناہ ہو اور مسکرا نے پہ ٹیکس لگ جانے کا خدشہ تھا۔ یونی کے پروفیسرز تک اس کی سنجیدہ طبیعت کے باعث اس سے محتاط انداز میں بات کرتے تھے۔ شروع کے کچھ عرصے میں کئی لڑکوں اور لڑکیوں نے اس سے دوستی کرنی چاہی مگر ہر بار آنکھوں میں سرد سا تاثر لیے انھیں دیکھ لینے پر دوبارہ کسی نے اس کی طرف دیکھنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ اس کے بعد سب نے اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا۔ ہاں اسے آتے جاتے دیکھنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ جو لوگ لوگوں کے بنائے قاعدے قوانین سے ذرا ہٹ کر چلتے ہیں وہ کچھ نہ کریں تب بھی ان کا ذکر عام ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ یونی میں اس کا ذکر عام تھا۔ بہت سے لوگ اسے نہ جان کر بھی اس کے بارے میں جانتے تھے۔ کسی نے نہ کبھی اسے کسی کے ساتھ دیکھا تھا، نہ کبھی کسی سے بات کرتے دیکھا تھا لیکن پھر بھی ہر کوئی اس کے بارے میں ساری معلومات رکھنے کا دعویدار تھا۔

وہ ہنسنے مسکرا نے کے معاملے میں جتنی کنجوس تھی لفظوں کے معاملے میں اس سے کئی گنا زیادہ کنجوس تھی۔ جب تک بات کرنا بے حد ضروری نہ ہوتا وہ بولنے کی زحمت نہیں کرتی تھی۔ کئی بار گروپ پراجیکٹس کے سلسلے میں اسے اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ کام کرنا پڑ جاتا تھا اور تب لوگ اس کی آواز سن لیتے تھے ورنہ بہت سے لوگ ایسے تھے جنہوں نے آج تک اس کی آواز بھی نہ سن رکھی تھی۔ بات کرنے کا انداز بھی ہمیشہ سنجیدہ اور دو ٹوک ہوتا تھا اور وہ پوری کوشش کرتی تھی کہ بات مختصر سے مختصر الفاظ میں

کی جاسکے یوں جیسے زیادہ بولنا ہی اس کی طبیعت پہ گراں گزرتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ جن لوگوں کے قریب تھی ان کے ساتھ بولنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتی تھی۔

یونی میں اس نے اپنا جو تاثر قائم کرنا چاہا تھا وہ اسے قائم کرنے میں اچھے سے کامیاب ہو گئی تھی۔ اس سوچ نے جیسے اس کے اندر توانائی سی بھر دی تھی۔ اپنے دشمنوں پہ بھی تو اس نے ایک تاثر بنا رکھا تھا۔ وہ جب جب یہ سوچتی تھی اس کا دل چاہتا وہ کھکھلا کر ہنس دے۔ دنیا بھری قوفوں سے بھری پڑی تھی اور پچھلے چند سالوں سے وہ چند گنے چنے لوگوں کے علاوہ ساری دنیا کو بہت اچھے سے بیوقوف بنا رہی تھی اور اپنے اس کارنامے پہ بڑا فخر محسوس کرتی تھی۔

کلاس روم میں داخل ہو کر وہ اپنی مخصوص سیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ شکر تھا کہ وہ پروفیسر کے آنے سے پہلے پہنچ گئی تھی۔ بیگ اور جیکٹ اتار کر ساتھ والی سیٹ پہ رکھے اور پھر اگلے دو گھنٹے پروفیسر کو بولتے سنتی رہی۔ اسٹوڈنٹس بیچ بیچ میں سوالات بھی کر رہے تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح سنجیدگی سے لیکچر سنتی اور اہم پوائنٹس نوٹ کرتی رہی۔ کلاس ختم ہونے کے بعد وہ باہر کی طرف بڑھ گئی۔ اگلی کلاس شروع ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ اس کا ارادہ کسی قریبی کیفے میں جا کر کچھ کھانے کا تھا۔ یونی کا کیفے ایک تو اسے پسند نہیں تھا پھر وہاں ہر وقت اسٹوڈنٹس کا رش لگا رہتا تھا اور بہت شور ہوتا تھا اس لیے وہ یونی کے پاس موجود کیفے میں جانے کو ترجیح دیتی تھی۔ پچھلے کئی سالوں سے وہاں جانے کی وجہ سے کیفے کی بوڑھی مالک اور ملازمین اسے بہت اچھے سے جانتے تھے۔ ان لوگوں سے اس کی اچھی سلام دعا تھی۔ وہ جیکٹ پہن کر بیگ کندھے پہ ڈالتے یونی کے گراؤنڈ سے گزرتے باہر کی طرف بڑھ گئی۔ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، بے نیازی سے گردن اکڑائے، چہرے پہ سنجیدہ سے تاثرات سجا کر چلتی احلام دمیر نہیں جانتی تھی کہ آج کے بعد اس کی زندگی بدلنے والی تھی۔ اب یہ بدلنا منفی تھا یا مثبت یہ وقت ہی بتا سکتا تھا۔



لاس اینجلس میں بھی ایک نئی صبح کا آغاز ہو چکا تھا۔ موسم کل کی نسبت آج قدرے بہتر تھا کیونکہ سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمکتا سارے شہر کو روشن کیے ہوئے تھا۔ ہوا میں ہلکی سی تپش تھی جو ٹھنڈے موسم کی بدولت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ سب لوگ معمول کے مطابق اپنے اپنے کاموں میں مصروف دکھائی دیتے تھے۔ ایسے میں مومن کمال اپنے کالج جانے کی بجائے التمش کے آفس کی جانب جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ لفٹ کے دروازے کھلے تو وہ باہر نکلتا دکھائی دیا۔ سیاہ سلیکس کے ساتھ لیڈر جیکٹ اور سفید جاگرز پہنے وہ آفس فلور پہ موجود ریسپشن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ سلکی بال کل کی طرح چھوٹی سی پونی میں باندھ رکھے تھے جن کی ایک لٹ نکل کر ماتھے پہ جھول رہی تھی۔ چہرے کے تاثرات سپاٹ تھے جبکہ بھوری آنکھوں میں گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ ریسپشنسٹ کے بتانے پر کہ التمش کمال اس وقت ایک میٹنگ میں ہے اور آدھے گھنٹے تک اس کے فارغ ہونے کے امکانات ہیں وہ سر ہلاتا اس کے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ آفس میں بیٹھے اسے بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ اپنے سیکریٹری سے بات کرتے آفس میں داخل ہوتے التمش نے اسے آرام دہ انداز میں صوفے پہ بیٹھے فون پہ انگلیاں اوپر نیچے پھیرتے دیکھ کر آنکھیں سکیڑ کر بغور اسے دیکھا۔ وہ یقیناً اسے یہاں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ التمش اپنے سیکریٹری کو جانے کا کہتے خود کوٹ کا بٹن کھولتا اس کے سامنے رکھے صوفے پہ آکر بیٹھ گیا۔

”خیریت؟“ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کر بیٹھتے آرام سے پوچھا۔ صوفے کے پیچھے موجود شیشے کی دیوار سے روشنی چھن کر اندر گر رہی تھی۔ مومن نے بلا آخر فون سے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر فون بند کر کے سامنے میز پہ رکھا اور ایک بار پھر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

”کچھ بات کرنی تھی۔ اور گھر میں کرنے سے ڈسٹر بنس ہو سکتی تھی اس لیے سوچا آفس بہتر رہے گا۔“
التمش نے اس کی بات سنتے سر ہلایا۔

”کل میں نے آپ کی اور ممی کی باتیں سن لی تھیں۔“ مومن نے بغور اس کے چہرے کو دیکھتے آرام سے کہا۔ التمش کے چہرے پہ کوئی تاثر نہ ابھرا۔ مینا کے بارے میں بات ہونے پہ اس کا چہرہ یونہی بے تاثر رہا کرتا تھا۔ مومن نے اسے کچھ نہ کہتے دیکھ کر بات جاری رکھی۔

”ممی کہہ رہی تھیں کہ آپ جانتے ہیں مینا کہاں ہے۔ میں آپ سے پوچھنے آیا تھا کہ اگر آپ جانتے ہیں تو بتا دیں وہ کہاں ہے۔ آپ کو نہیں لگتا کہ اب اسے واپس گھر آ جانا چاہیے؟“ سنجیدگی سے کہتے آخر میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”وہ اپنی مرضی سے گئی ہے اور اگر اپنی مرضی سے واپس آنا چاہتی ہے تو آ سکتی ہے مگر میں اسے واپس نہیں لاؤں گا۔ ہاں تم اسے ڈھونڈنا چاہو تو ڈھونڈ سکتے ہو۔“ اس نے بھی اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔ دونوں کے انداز سے بالکل نہیں لگتا تھا باپ بیٹا بات کر رہے ہوں۔ یوں لگتا تھا دو حریف آپس میں بات کر رہے ہوں۔ مومن اس کی بات سن کر چند لمحے گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

”کیا آپ جانتے ہیں وہ کہاں ہے؟“ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا یوں جیسے جان لینا چاہتا ہو کہ آیا وہ سچ بول رہا ہے یا نہیں۔

”نہیں۔“ التمش نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یک لفظی جواب دیا۔ دونوں کے درمیان چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ فضا میں عجیب سا سردین حائل ہو گیا تھا۔ مومن نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔ کچھ تھا اس کے انداز میں جس نے التمش کمال کو چونکا یا تھا۔ کچھ غیر معمولی سا، کچھ نیا سا، کچھ غیر

آرام دہ سا۔ دونوں کے تعلقات کچھ خاص اچھے نہیں تھے لیکن یہ انداز و اطوار مومن کمال کے نہیں تھے۔ وہ بہت جلد غصے میں آجانے والوں میں سے تھا۔ اور التمش کمال کے تو قصور ہی اتنے تھے کہ مومن اس سے غصہ کیے بغیر بات کرتا ہی نہیں تھا۔ آج خلاف معمول وہ ابھی تک پرسکون انداز میں بیٹھاباٹ کر رہا تھا۔ اسے حیرت نہ ہوتی تو کیسے نہ ہوتی۔

”کل آپ مئی سے لاریب کے بارے میں بھی پوچھ رہے تھے۔“ کچھ دیر بعد اس نے دوبارہ بات کا آغاز کیا۔ التمش نے اس کی بات پہ سر ہلایا۔ ”مینا کا معاملہ مختلف ہے۔ اس میں بہت سی چیزیں آجاتی ہیں اس لیے اس معاملے کو ابھی چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن۔۔۔“ وہ ایک لمحے کو رکا۔ ”لاریب معصوم ہے۔ مینا کے بعد سنبھلنے میں اسے کافی وقت لگا ہے اور اس چیز نے اسے مزید حساس بنا دیا ہے۔“ بات کے دوران وہ قدرے آگے کو جھکا اور دونوں ہاتھ باہم ملا کر کہنیاں گھنٹوں پہ رکھتے التمش کمال کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ ”اس کے معاملے میں میں ذرا سی بھی کوتاہی برداشت نہیں کروں گا۔“ ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ ادا کیا۔ التمش کمال کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنہٹ سی پیدا ہوئی لیکن بظاہر وہ سنجیدگی سے بیٹھا آنکھیں سیڑے سے دیکھتا رہا۔

BEING THE STRING OF YOUR KITE

”تمہیں خود سے زیادہ ان دونوں کی فکر کیوں ہے؟“ سنجیدگی سے پوچھا کیونکہ وہ واقعی جاننا چاہتا تھا۔

”کیونکہ ان کے باپ کو ان کی فکر نہیں ہے۔ اسے اپنے اور اپنے بزنس کے علاوہ کچھ دکھتا ہی نہیں ہے۔ اب کسی کو تو یہ کرنا پڑے گا۔ اگر باپ برا ہو تو بھائی کو اچھا ہونا پڑے گا۔“ ہلکی سی مسکراہٹ سجا کر کہا۔ اس کی بات سنتے التمش کا چہرہ ایک دم تاریک پڑا۔ چند لمحے وہ کچھ بول نہیں سکا۔ اسے مومن سے اتنی تلخ بات کہنے کی امید نہیں تھی۔

”ہم اچھے یا برے نہیں ہوتے مومن۔“ وہ ایک لمحے کو رکا۔ ”ہم بس ہر کسی کے لیے اچھے ثابت نہیں ہو پاتے۔“ کئی لمحوں بعد وہ بولا تو آواز پہلے جیسی نہیں تھی۔ عجیب تھکن زدہ سی لگتی تھی۔ چند لمحے وہ یونہی مومن کو دیکھے گیا۔ وہ بے تاثر سا چہرہ لیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ التمش بھی چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔

”حفیظ شاہنواز اچھا انسان نہیں ہے۔“ اگر بات بزنس کی ہو ہی رہی تھی تو پھر یہ بات بھی کر ہی لینی چاہیے تھی۔ مومن کمال کے لیے یہ حملہ غیر متوقع تھا۔ کتنی ہی دیر وہ کچھ بول نہیں سکا۔ بس شاک کی سے انداز میں اپنے باپ کو دیکھے گیا جسے معلوم تھا کہ کب، کس جگہ، کس مقام پہ، کس انداز سے چوٹ کرنی ہے۔

”اس کا یہاں کیا ذکر؟“ مومن کا انداز اب کی بار سختی لیے ہوئے تھا۔

”اس کا نہیں لیکن اس کی بیٹی کا ذکر ضرور بنتا ہے۔ تم اس کی طرف سے بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو۔“ اب کے اس کا انداز پر سکون تھا۔ مومن کے جبرے بھیج سے گئے۔ چہرے سے غصہ جھلکنے لگا تھا۔ چند لمحے اس نے گہرے سانس لیتے خود کو پرسکون کرنا چاہا۔

”اسمارہ کے ساتھ جو آپ نے کیا وہ غلط تھا اور اس کا حساب آپ کو دینا پڑے گا یہ بات یاد رکھیے گا۔“ چبا چبا کر اس نے کہا تو التمش نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔

”حفیظ شاہنواز اپنی بیٹی کے ذریعے تمہیں میرے مقابل لانا چاہتا تھا۔ تم ابھی بچے ہو ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔“ التمش نے ایک بازو صوفے کی پشت پہ پھیلاتے آرام سے کہا۔

”حفیظ شاہنواز سے آپ کی جو بھی دشمنی تھی آپ کو اسے اس تک ہی محدود رکھنا چاہیے تھا۔ اسمارہ کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کے کردار کی دھجیاں اڑا کر آپ نے اسے نہیں خود کو میری نظروں میں گرا لیا ہے۔“ التمش نے اب کی بار اس کی بات پہ کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کیا۔ ”سات ماہ ہو چکے ہیں اس بات کو

لیکن وہ آج تک گھر سے باہر نہیں نکل سکی۔ وہ آج تک لوگوں کی نظروں کا سامنا کرنے کے قابل نہیں ہو سکی۔ آپ نے اسے اس کی خود کی ہی نظروں میں گر ادیا ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھیے گا۔ ”وہ ایک لمحے کو رکا۔“ آپ کو حساب دینا پڑے گا۔ اسمارہ کا میری نظر میں جو مقام سات ماہ پہلے تھا آج بھی وہی ہے۔ آپ ہزار بار کوشش کر لیں اسے میرے دل سے نہیں نکال سکتے۔“ التمش نے اب کہ ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ چہرے پہ محفوظ کن مسکراہٹ تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے اس کی تقریر سے واقعی متاثر ہوا ہو۔ اپنی بات مکمل کر کے مومن سپاٹ سا چہرہ لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”میں کہاں ہے میں ڈھونڈ لوں گا۔ اسمارہ کے ساتھ جو ہوا اس کا بدلہ بھی ضرور لوں گا لیکن ایک بات یاد رکھیے گا۔“ اپنی بات کہتے ہوئے وہ رکا۔ آنکھیں التمش کمال کی آنکھوں میں گاڑھیں۔ ”لاریب کو ذرا سی بھی تکلیف پہنچی تو میں آپ کو تباہ و برباد کر دوں گا۔“ التمش سابقہ انداز میں پرسکون سی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے، چہرہ اٹھائے اسے دیکھتا رہا۔

”سات ماہ پہلے کے مومن میں اور آج کے مومن میں خاصا فرق معلوم ہو رہا ہے۔“ التمش کے لہجے میں اب کی بار فخر سا تھا۔ اسے یاد تھا اسمارہ کی ویڈیوز وائرل ہونے پہ اس نے کیسا جذباتی سارِ عمل دیا تھا۔ اسے افسوس ہوا تھا کہ وہ اس کا بیٹا تھا لیکن آج۔۔۔ آج اس کا ہر ہر انداز بدلہ ہوا تھا۔ آج اس نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ التمش کمال کا بیٹا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ ان سات ماہ میں ان کے درمیان سات صدیوں جتنا فاصلہ آگیا تھا۔ ”اس بدلاؤ کی کوئی خاص وجہ؟“ مومن چند لمحے چہرہ اٹھا کر خود کو دیکھتے التمش کو دیکھتا رہا۔

”کہتے ہیں کامیابی کی منزل طے کرنے کے لیے اپنے دماغ اور جذبات کو قابو کرنا بے حد ضروری ہے، میں بھی بس وہی کر رہا ہوں۔“ سنجیدگی سے کہتے ایک آخری نگاہ اس پہ ڈالتے وہ باہر کی طرف بڑھ گیا۔ پیچھے التمش کے لبوں پہ ایک خوبصورت سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ مومن واقعی اس کا بیٹا تھا۔ حفیظ شاہنواز اس کے

منہ پہ اسے اپنی بیٹی کی دھمکی دے کر گیا تھا۔ بزنس میں کئی سالوں سے وہ اس کا حریف تھا اور اب مومن کے ذریعے اسے نقصان پہنچانا چاہ رہا تھا۔ التمش کمال نے اس کی یہ کوشش بڑی آسانی سے ناکام بنا دی تھی۔ تہمینہ اسے غلط سمجھتی تھی، سمجھتی رہے۔ مومن اس کے بارے میں غلط سوچتا تھا، سوچتا رہے۔ لاریب اس سے نفرت کرتی تھی، کرتی رہے۔ وہ اگر سامنے نظر آتی چیز کو دیکھ کر اسے الزام دے رہے تھے، تو دیتے رہیں۔ وہ گھر کا سربراہ تھا۔ جو وہ دیکھ رہا تھا وہ ان میں سے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ انھیں چھوٹے نقصان دے کر بڑے نقصانات سے بچا رہا تھا اور وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ انھیں تباہ کر رہا ہے تو سمجھتے رہیں۔ صفائی دینے کا یا کچھ بھی بتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ نہ کسی نے اسے سننا تھا، نہ سمجھنا تھا، نہ اس کی ماننی تھی، نہ اعتبار کرنا تھا۔ وہ سب کچھ اپنے طریقے سے ہینڈل کر رہا تھا۔ انھیں کھو کر وہ انھیں محفوظ رکھ رہا تھا تو یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی۔ انھیں محفوظ رکھنے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا، کوئی بھی قیمت ادا کر سکتا تھا اور وہ ادا کر رہا تھا۔ رہا مینا کا معاملہ تو وہ سرے سے ہی الگ بات تھی۔ پرسکون سی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے وہ مومن کو آفس کے دروازے سے نکلتے دیکھتا رہا۔ آفس کے دروازے سے باہر نکلتا مومن جانتا تھا کہ التمش کو معلوم تھا مینا کہاں ہے لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ بتائے گا نہیں کہ وہ کہاں ہے۔

☆☆☆☆☆

ہلکی ہلکی دھوپ صبح کے اس پہر چاروں اور پھیلی سبزہ زار کو روشن کیے ہوئے تھی۔ اسٹوڈنٹس معمول کے مطابق یہاں سے وہاں جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ ہر سو چہل پہل سی جاری تھی۔ معاویہ کالج کے دروازے کے پاس گراؤنڈ کے ایسے حصے میں کھڑا بے چینی سے ٹہل رہا تھا جہاں سے اندر آتے لوگوں کو با آسانی دیکھا جاسکتا تھا۔ بال ہمیشہ کی طرح پونی میں باندھ رکھے تھے اور سر سے پاؤں تک سیاہ رنگ زیب

تن کر رکھا تھا۔ ہلکی بڑھی داڑھی والے چہرے پہ پریشانی اور اضطراب کے ملے جلے تاثرات رقم تھے۔ آج وہ قدرے جلدی آگیا تھا اور اب لاریب کا انتظار کر رہا تھا۔ کل سے وہ اس کی کالز پک نہیں کر رہی تھی نہ ہی کسی میسج کا جواب دے رہی تھی۔ معاویہ اس کے لیے خاصا پریشان تھا۔ مومن سے بات ہونے پہ اس نے بس یہی بتایا تھا کہ وہ تھوڑی ڈسٹرب ہے، کل تک ٹھیک ہو جائے گی اور اس چیز نے اسے مزید پریشان کر دیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر مزید گزری تھی کہ وہ آتی دکھائی دی۔ لانگ اسکرٹ کے ساتھ لانگ بوٹس پہنے وہ تیز قدموں سے چلتی اندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بال اونچی پونی ٹیل میں باندھ رکھے تھے اور کٹے بال ماتھے پہ ایک طرف کو گر رہے تھے۔ اسے آتے دیکھ کر معاویہ نے بے اختیار گہرا سانس لیا، ہونٹوں پہ بے ساختہ ایک پرسکون سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ اس کے چہرے کو بغور دیکھتے اس نے اندازہ لگانا چاہا اور اس کی توقع کے عین مطابق چہرہ اداس اور مضحک سا لگتا تھا۔

”ہائے، کیسی ہو؟“ وہ جو اندر کی طرف جا رہی تھی پیچھے سے آتی معاویہ کی آواز پہ چونک کر پلٹی۔

”ہائے، واٹس اپ؟“ ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے کہا تو معاویہ مسکرا دیا۔

”تم نے پوٹریٹ مکمل کر لیا؟“ اس کے ساتھ اندر کی طرف بڑھتے لاریب نے پوچھا تو معاویہ نے سر ہلایا۔

”آؤ تمہیں دکھاتا ہوں۔“ وہ اسے ساتھ لیے اسٹوڈیو کی طرف چل دیا جو پوٹریٹ کے لیے ان کی کلاس کو الاٹ کیا گیا تھا۔ معاویہ نے اس کی کالز اور میسجز کا جواب نہ دینے پہ کوئی شکوہ نہیں کیا۔ لاریب کو اس کی یہ بات بہت پسند تھی۔ اسے اگلے بندے کو اس کی اسپیس دینا آتا تھا۔ وہ کبھی کوئی شکوہ شکایت نہیں کرتا تھا، اسے شکایت کرنا آتا ہی نہیں تھا۔ وہ لاریب کو کبھی بھی کسی بھی بات کے لیے فورس نہیں کرتا تھا اگر وہ بتانا

چاہتی تو بتا دیتی تھی ورنہ معاویہ اس سے پوچھا نہیں کرتا تھا۔ پھر اسے پتا تھا اس نے مومن کو کال کر کے پوچھ لیا تھا اس لیے اسے تھوڑا بہت انداز ہو گا۔

اندر اسٹوڈیو کی طرف بڑھتے معاویہ نے ساتھ چلتی لاریب کو ایک نظر دیکھا پھر جیکٹ کی پاکٹ سے چاکلیٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ لاریب نے پہلے چونک کر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر دھیمسا مسکرا دی۔ وہ کٹ کیٹ اس کی طرف بڑھائے ہوئے تھا۔ اسے پتا تھا کٹ کیٹ اس کی پسندیدہ چاکلیٹ تھی۔ معاویہ اس کے لیے ایسی چھوٹی چھوٹی ایفرٹس کرتا رہتا تھا اور اس کا یہ سب کرنا لاریب کو بہت پسند تھا۔

”تھینکیو معاویہ۔“ چاکلیٹ اس کے ہاتھ سے لیتے اس نے مشکور سے انداز میں کہا۔ معاویہ ایک بار پھر مسکرا دیا۔ کبھی کبھی اسے معاویہ پہ بڑا پیار آتا تھا۔ وہ کم بولتا تھا یہ اسے پتا تھا۔ اس لیے محبت کا اظہار اس نے الفاظ کی صورت کبھی نہیں کیا تھا لیکن اپنے ہر عمل سے اسے یہ ضرور باور کروایا تھا کہ وہ اس کے لیے کتنی اہم ہے۔ وہ جس طرح اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں نوٹ کرتا تھا، انھیں یاد رکھتا تھا، اپنے عمل سے جب یہ باور کروایا تھا کہ ہاں اسے اس سے محبت ہے تو لاریب کے دل میں اس کا مقام مزید بڑھ جاتا تھا اور یہ سب لاریب کو اس کی اپنی ہی نظر میں معتبر بناتا تھا۔ وہ جب اس کے ساتھ ہوتی تھی تو اسے بہت اچھا محسوس ہوتا تھا۔ دونوں کے درمیان کبھی باقاعدہ محبت کا اظہار نہیں ہوا تھا لیکن پھر بھی دونوں کے انداز و اطوار ایک دوسرے کو بتا دینے کو کافی تھے کہ ہاں یہاں محبت موجود ہے۔

معاویہ نے اسٹوڈیو میں داخل ہوتے ایک بار پھر اسے دیکھا۔ لاریب کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ تھی اور وہ پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔ معاویہ دھیمسا مسکرا دیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ایفرٹس پہ جب وہ یوں خوش ہوتی تھی تو اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ اندر آ کر اس نے ایک طرف دیوار کے ساتھ رکھے پوٹریٹ

کو اٹھا کر سیدھا کیا اور اس کا رخ لاریب کی طرف کرتے اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔ اسٹوڈیو میں چند اور اسٹوڈنٹس بھی موجود تھے اور اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

”معاویہ۔۔۔۔ اٹس جسٹ۔۔۔۔ اٹس سو امیزنگ۔“ لاریب کے چہرے پہ چھائی خوشی دیدنی تھی۔ وہ چہرے پہ بچوں کی سی معصومیت اور جوش لیے کینوس پہ موجود اپنی پینٹنگ پہ اوپر سے نیچے ہاتھ پھرتے ہوئے بولی۔ آنکھوں میں جگنوؤں کی سی چمک تھی۔ معاویہ مبہوت سا اسے دیکھے گیا، لبوں پہ گہری مسکراہٹ بکھر گئی۔ اسے اندازہ نہیں تھا لاریب کو اس کا بنایا ہوا پوٹریٹ اتنا پسند آئے گا۔

”اٹس جسٹ سو پرفیکٹ۔“ اب کے وہ پوٹریٹ کو ایک آرٹسٹ کی نظر سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہر کلر اپنی جگہ پر فیکٹ ہے۔ یہ جو تم نے اسے گولڈن، سیلو اور اورنج کا ٹچ دیا ہے نایہ بہت اچھا لگ رہا ہے۔“ وہ اس کے پوٹریٹ کی کھلے دل سے تعریف کرتے ہوئے بولی۔ معاویہ کو اس کی یہ بات بہت پسند تھی وہ تعریف کرنے میں کنجوسی نہیں کرتی تھی۔ ”اور میری آئیز کا کلر دیکھو، کتنا پیارا لگ رہا ہے نا۔ کیا میری آنکھیں اصل میں بھی ایسی ہی پیاری لگتی ہیں؟“ پوٹریٹ سے نظر ہٹا کر معاویہ کو دیکھ کر پوچھا تو ایک لمحے کو معاویہ گڑبڑا سا گیا۔ اس نے کبھی لاریب کے منہ پہ اس کی خوبصورتی کی تعریف نہیں کی تھی۔ اور اس لمحے اسے احساس ہوا کہ لاریب سے اپنے احساسات اور جذبات کا اظہار کرنا اس کے لیے دنیا کا مشکل ترین امر تھا۔ اس نے جواب میں کچھ کہنے کی بجائے سر ہلادیا۔ لاریب واپس پوٹریٹ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”کل جو تمہاری پکچر بنائی تھی وہ اسی لیے بنائی تھی۔ اس میں کلرز پر فیکٹ تھے۔“ لاریب نے اس کی بات پہ سر ہلایا۔

”مجھے لگا تھا کہ میں تم سے زیادہ اچھا بناؤں گی لیکن اب تمہارا پوٹریٹ دیکھ کر لگ رہا ہے کہ میرا اتنا اچھا نہیں ہو گا۔“ وہ ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلا کر بولی۔

”تم بہت اچھی آرٹسٹ ہو۔ دیکھنا تمہارا اس سے کئی گنا زیادہ اچھا ہو گا۔“ معاویہ نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ لاریب نے ایک آخری نظر پوٹریٹ پہ ڈال کر اسے واپس ایک طرف رکھا اور اس کی طرف مڑی۔

”شروع کریں پھر؟“ مسکرا کر اسے دیکھتے پوچھا۔ معاویہ نے بھی مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

”تم نے میرے پوٹریٹ میں صرف رنگ نہیں بھرے، تم نے اس میں میری وائبرینچ کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری وائبرینچر اور کلرز ہیں۔ میں نے کل تمہیں اسی لیے ڈارک پہن کے آنے کو کہا تھا کیونکہ تمہاری وائبرینچر ڈارک کلرز ہیں۔ تمہیں کسی اور کالر میں پینٹ کیا جائے تو وہ اچھا تو ہو گا مگر پرفیکٹ نہیں ہو گا۔ مجھے بعد میں اس چیز کا خیال آیا اس لیے گھر جا کر میسج کیا تھا۔“ یہ وہ وضاحت تھی جو اس نے نہیں مانگی تھی لیکن لاریب نے اسے دے دی تھی۔ وہ جو کل سارا دن اس کے ایک میسج پہ پریشان رہا تھا اس کی وضاحت انتہائی سادہ سے انداز میں دے دی گئی تھی۔ معاویہ نے سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

”اس لیے تمہیں باہر گراؤنڈ میں پینٹ نہیں کیا جاسکتا۔“ وہ اسٹوڈیو میں ارد گرد نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔ اسٹوڈیو کی دیواریں گہرے بھورے رنگ کی تھیں اور چاروں جانب مختلف رنگوں کے شیشوں والی بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں جو باہر گراؤنڈ کی طرف کھلتی تھیں۔ سورج کی روشنی بند کھڑکیوں کے شیشوں سے منعکس ہو کر اندر گر رہی تھی۔ وہ چند لمحے دائیں جانب موجود آتشی رنگ کی بند کھڑکی کو دیکھتی رہی پھر معاویہ کی طرف مڑی۔

”اس کھڑکی کے سامنے بیٹھنا تمہاری وابستہ کیچ کرنے کے لیے پرفیکٹ رہے گا۔ بند کھڑکی سے سورج کی ہلکی ہلکی روشنی تمہارے چہرے پہ پڑے گی اور میں تمہیں بلیک اینڈ وائٹ میں پینٹ کروں گی۔ پرفیکٹ۔“ وہ واپس کھڑکی کی طرف دیکھ کر بولی۔ معاویہ نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

”چلو آ جاؤ پوز کی پکچرز لے لیتے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ آج آؤٹ لائن کمپلیٹ کر لوں۔“ وہ کہتے ہوئے ایک طرف رکھے میز پہ موجود اپنے بیگ کی طرف بڑھ گئی۔ معاویہ نے کرسی کھینچ کر کھڑکی کے آگے رکھی۔ اگلی کچھ دیر لاریب اسے ہدایات دیتی رہی اور اس کے پوز کی چند ایک تصویریں بنانے کے بعد بلا آخر اس نے فون ایک طرف رکھا اور کینوس کو ایزل پہ سیٹ کرتے معاویہ کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ معاویہ اسی پوز میں بیٹھا مسکراہٹ چہرے پہ سجائے اسے یہ سب کرتے دیکھتا رہا۔

لاریب پوری طرح اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ پنسل ہاتھ میں پکڑے وہ کبھی معاویہ کو دیکھتی، کبھی فون میں موجود اس کی تصویروں کو اور پھر واپس کینوس پہ پنسل چلانے لگتی۔ معاویہ خاموشی سے بیٹھا اس کا مشاہدہ کرتا رہا۔ لاریب کو دیکھتے رہنا اس کا پسندیدہ کام تھا۔ کبھی کبھی لاریب کا اس کی زندگی میں موجود ہونا اسے ایک عجیب سا اتفاق لگتا تھا۔ وہ ہمیشہ سے سنجیدہ اور ریزرو سی طبیعت کا مالک رہا تھا۔ بچپن میں چند ایک دوست تھے لیکن پھر وقت کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں تبدیلی آتی گئی۔ اس نے دوست بنانا چھوڑ دیئے۔ لوگوں سے اسے عجیب سی اکتاہٹ ہونے لگی تھی لیکن پھر۔۔۔ پھر لاریب اس کی زندگی میں تازہ ہوا کے جھونکے کی مانند آئی اور ٹھہر گئی۔ لڑکیوں میں اسے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن لاریب میں کچھ مختلف تھا۔ جو وہ اس کے لیے محسوس کرتا تھا وہ اس نے آج تک کبھی کسی کے لیے محسوس نہیں کیا تھا اور جو وہ اس کے لیے محسوس کرتا تھا وہ اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یقین تھا لاریب کے علاوہ وہ کبھی کسی لڑکی کے لیے ایسا محسوس نہیں کر سکے گا۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا لاریب جیسے اچانک اس

کی زندگی میں آئی تھی ویسے ہی اچانک چلی بھی جائے گی اور یہ خیال ایسا تھا کہ اس کی سانسیں تھمنے لگتیں۔ پھر وہ اس خیال کو جھٹک دیتا۔ لاریب کے متعلق وہ کوئی بھی برا خیال ذہن میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ لاریب اس کی زندگی کا محور تھی۔ اس کی بے رنگ زندگی کو رنگوں سے بھرنے والی ذات اس کی تھی۔ وہ اس کی زندگی کا سب سے اہم جز تھی۔ چہرے پہ مسکراہٹ سجائے وہ محو سا اس کے سنجیدہ چہرے کو دیکھتا رہا پھر جانے اس کے ذہن میں کیا سمایا کہ ایک دم بول پڑا۔

”لاریب۔۔۔“ آواز دے کر اسے متوجہ کرنا چاہا۔

”ہمم۔“ اپنے کام میں مصروف لاریب نے ہنکارا بھرا۔

”تمہاری زندگی میں سب سے اہم انسان کون ہے؟“ کینوس پہ پنسل چلاتا لاریب کا ہاتھ ایک دم ساکت ہوا۔ نظر اٹھا کر اس نے معاویہ کو دیکھا۔ وہ نظریں۔۔۔ وہ اندر تک زخمی لگتی تھیں۔ معاویہ بے اختیار پچھتایا۔ اس نے شاید غلط سوال پوچھ لیا تھا۔ یا شاید غلط وقت پر پوچھ لیا تھا۔ لاریب نے نگاہیں واپس کینوس کی جانب موڑ لیں۔ معاویہ کے دل میں ملال گہرا ہوا۔ اسے خوش دیکھنے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اس کی وجہ سے وہ ادا اس ہو یہ تکلیف گہری تھی۔

”مینا۔“ کئی لمحوں بعد اس کی آواز ابھری۔ ایک لفظی جواب دے کر وہ واپس پنسل چلانے لگی۔ اب کے انداز میں پہلے والا جوش مفقود تھا۔ معاویہ نے کرب سے آنکھیں میچ کر کھولیں۔ آہ۔۔۔ اسے اندازہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ اتنی بڑی غلطی کیسے کر سکتا تھا۔ ادا اس نظروں سے وہ لاریب کے سنجیدہ چہرے کو دیکھے گیا۔ مینا کے بارے میں وہ بس اتنا جانتا تھا کہ وہ اب لاریب لوگوں کے ساتھ نہیں رہتی تھی اور یہ چیز لاریب کو تکلیف دیتی تھی کیونکہ لاریب کو اپنی بہن سے بہت محبت تھی۔ ایک بار باتوں باتوں میں اس نے بس اتنا سا

ذکر کیا تھا کہ مینا کے ڈیڈ کے ساتھ کچھ ایشوز چل رہے ہیں جس وجہ سے وہ اب ان کے ساتھ نہیں رہتی۔ اس سے زیادہ نہ اس نے بتایا تھا نہ اس نے پوچھا تھا۔ لیکن معاویہ اس کے بعد سے مینا کے ذکر کو لے کر محتاط ہو گیا تھا۔ وہ پوری کوشش کرتا تھا کہ اس کے سامنے کسی بھی طرح سے مینا کا ذکر نہ آئے کیونکہ اس کا ذکر لاریب کو تکلیف دیتا تھا۔ ایک گہرا سانس لیتے وہ لاریب کے چہرے کو دکھ بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔ اسے نئے سرے سے پچھتاوے نے آگھیرا۔ لاریب خاموشی اور سست روی سے اپنا کام کرتی رہی۔ باہر سورج کی روشنی اپنا رخ بدلتی رہی۔ وقت اپنی رفتار سے چلتا رہا۔ اندر وہ دونوں اپنی اپنی جگہ اداس چہرہ لیے ایک دوسرے سے نظریں چراتے رہے۔

☆☆☆☆☆

صبح کا سورج نکلے کافی دیر بیت چکی تھی لیکن موسم قدرے ابر آلود ہونے کے باعث سورج کی کرنیں زمین کو چھونے سے قاصر تھیں۔ عدن اپنے سویٹ میں موجود باہر جانے کی تیاری کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ سفید ٹی شرٹ کے ساتھ بھوری سلیکس اور بھوری جیکٹ پہنے وہ اس وقت جاگرز کے تسمے بند کر رہا تھا۔ بھورے بال سلکی ہونے کے باعث ماتھے پہ گر رہے تھے۔ سیاہ آنکھیں سنجیدہ دکھائی دیتی تھیں۔ جوتے پہننے کے بعد اس نے برش اٹھا کر ماتھے پہ گرتے بالوں کو اچھے سے سیٹ کر کے پیچھے جمایا اور ایک آخری نگاہ آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پہ ڈالتا فون اور والٹ اٹھا تا باہر کی طرف بڑھ گیا۔

کل سے وہ اس ہوٹل میں بند تھا۔ اسے یوں ایک جگہ ٹک کر بیٹھنے اور بند ہونے کی عادت نہیں تھی۔ پھر عموماً وہ صبح جم بھی جایا کرتا تھا مگر اب یہاں ہونے کے باعث وہ نہیں جاسکا تھا اس لیے اس کا ارادہ تھوڑی واک کرنے اور پھر کہیں باہر ناشتہ کرنے کا تھا۔ اپنے ساتھ آئے اسٹاف ممبرز کو وہ بتا چکا تھا کہ وہ ساڑھے گیارہ بجے تک انھیں اس ہال میں ملے گا جو کمپنی نے ڈاکیومنٹری کی شوٹنگ کے لیے ریزرو کروا رکھا تھا۔

شوٹنگ آج نہیں ہونی تھی۔ آج صرف اس بندے سے ملنا اور چیزوں کو ڈسکس کرنا تھا اور کچھ دوسری چیزوں پہ کام کرنا تھا۔

یہاں موسم لاس اینجلس کی نسبت ذرا زیادہ سرد تھا۔ باہر آتے ہی اس نے جیکٹ کی زپ بند کی اور ارد گرد دیکھتا آگے بڑھنے لگا۔ چونکہ موسم ابر آلود تھا اس لیے ہلکی ہلکی چلتی ہوا بھی خاصی سرد معلوم ہو رہی تھی۔ وہ آج سے پہلے یہاں کبھی نہیں آیا تھا۔ ان کے چینل کا ہیڈ کوارٹر لاس اینجلس میں تھا لیکن ایک برانچ یہاں بھی موجود تھی مگر دوسرے شہروں میں موجود برانچز کے وزٹس تبریز خان خود دیکھا کرتے تھے اس لیے یہاں بھی ہمیشہ وہی آتے تھے۔ پھر اسے ایسے کاموں میں دلچسپی بھی نہیں تھی اور وہ کوفت کا شکار ہوتا تھا اس لیے تبریز خان وزٹس کا اسے نہیں کہتے تھے۔

آج پہلی بار وہ یہاں آیا تھا تو کمپنی کی برانچ کا وزٹ بھی اس کے ذمہ تھا کیونکہ پیچھے کی ساری ذمہ داری تبریز خان پہ آن پڑی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ شام تک ڈاکیومنٹری کے معاملات سے فارغ ہو کر وہ وزٹ بھی کر لے گا تاکہ اگلے چند دن وہ آرام سے ڈاکیومنٹری پہ کام کر سکے اور اگر کچھ وقت ملے تو شہر بھی گھوم لے۔ عرصہ ہوا تھا اس نے کوئی سیر و تفریح نہیں کی تھی اسی بہانے وہ بھی کر لے گا۔

چلتے چلتے وہ ہوٹل سے کافی دور نکل آیا تھا۔ ایک بات جو اس نے نوٹ کی تھی وہ یہ تھی کہ یہاں لاس اینجلس کی نسبت ہریالی بہت زیادہ تھی۔ وہ ارد گرد سے بے نیاز چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ فون کی آواز پہ چونکا۔ ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈال کر فون باہر نکالتے نظر اسکرین پہ چمکتے نام پہ ڈالی تو ہونٹ بے ساختہ مسکراہٹ میں ڈھل گئے۔

”خان صاحب۔۔۔“ فون کان سے لگاتے اس نے خوشگوار سے انداز میں کہا تو دوسری طرف موجود تبریز خان ہنس دیئے۔ ”کہیے کیسے یاد کیا۔ یہاں تو جب تک لوگوں کو کام نہ پڑے بھول ہی جاتے ہیں۔“ اس کی ہشاش بشاش آواز سن کر تبریز خان پر سکون سے ہو گئے تھے۔

”تم نے تو یاد کیا نہیں سوچا ہم ہی کر لیں۔“ وہ بھی اسی کے انداز میں بولے۔ اب کی بار عدن ہنس دیا۔ چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے کال کاٹ دی۔ اسماء کو وہ بعد میں کال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اور معاویہ۔۔۔ اسے وہ کل بھی دوبار کال کر چکا تھا۔ اس نے کال نہیں اٹھائی تھی اس لیے اسے کال کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اسے معلوم تھا اس نے کال نہیں اٹھائی۔

کال بند کرنے کے بعد وہ ایک قریبی کیفے میں چلا آیا۔ کیفے کی دیواریں اندر باہر سے ہلکے سبز رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ ایک طائرانہ نگاہ کیفے کی سجاوٹ پہ ڈالتا قدرے کونے والی میز پہ آ بیٹھا۔ کیفے کی سجاوٹ قدرتی اور مصنوعی پودوں اور پھولوں سے کی گئی تھی۔ ایک طرف مصنوعی بلیں لگیں دیکھنے والے کو خوشگوار سا تاثر دیتی تھیں تو دوسری طرف کئی ان ڈور پلانٹس کے چھوٹے گولے گملے ایک طرف رکھے ریک میں ترتیب سے اوپر سے نیچے لگے تھے۔ میز پہ رکھے مینیو کارڈ سے اپنے لیے آرڈر کرنے کے بعد وہ ایک بار پھر ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگا۔ کیفے میں اس وقت رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ چند ایک لوگ ہی بیٹھے نظر آرہے تھے۔ وہ خاموشی سے انھیں دیکھے گیا۔ کل کی توڑ پھوڑ کے بعد آج وہ واپس اپنے خول میں سمٹ آیا تھا۔ کوئی پریشانی، کوئی اداسی اس وقت اس کے چہرے پہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ہاں پر سکون سی مسکراہٹ اور اطمینان ضرور چہرے پہ دکھتا تھا۔

آرڈر کے لیے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس کا آرڈر آ گیا تھا۔ کافی کا ایک گھونٹ بھر کر ہی اس کے اندر باہر جیسے سکون سا اتر گیا تھا۔ جس نے بھی کافی دریافت کی تھی اس نے یقیناً اس پہ

احسانِ عظیم کیا تھا۔ وہ پرسکون انداز میں ناشتے سے انصاف کر رہی رہا تھا کہ پیچھے سے آتی زوردار ہنسی کی آواز سن کر بے اختیار مڑا۔ کاؤنٹر کے پاس کوئی لڑکی اس کی طرف پشت کیے کھڑی تھی اور کاؤنٹر کے دوسری طرف موجود عورت سے کچھ کہتے ہوئے ہنس رہی تھی۔ یہاں سے کاؤنٹر قدرے فاصلے پہ موجود تھا اس لیے وہ سن نہیں پایا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ لڑکی اسی وقت ہلکا سا مڑتے ایسی کھڑی ہوئی کہ اب اس کا نیم رخ واضح تھا۔ عدن سر جھٹکتا واپس مڑا اور ہاتھ سامنے رکھے کافی کے کپ کی طرف بڑھایا لیکن پھر۔۔۔۔۔ پھر ایک دم ٹھہر گیا۔ دماغ میں جیسے کچھ کلک ہوا تھا۔ اس نے گردن تیزی سے موڑتے لڑکی کو ایک بار پھر دیکھا۔ گردن اتنی تیزی سے موڑی تھی کہ باقاعدہ چٹخنے کی آواز آئی تھی۔ وہ چند لمحے آنکھیں پھیلانے لڑکی کے نیم رخ کو دیکھے گیا۔ کیا وہ وہی تھی؟ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ یقیناً اس کا وہم تھا۔ اس نے اس خیال کو جھٹکنے کی کوشش کی لیکن۔۔۔ لڑکی اسی وقت پوری کی پوری اس کی طرف پلٹی۔ عدن کی آنکھیں بے یقینی سے مزید پھیل گئیں۔ ان آنکھوں میں اتنی بے یقینی تھی کہ وہ ہلنے تک سے قاصر تھا۔ وہ یہاں تھی؟ وہ یہاں کیسے تھی؟ اوہ خدا یا وہ وہی تھی۔ وہ وہی تھی۔ وہ شل ساکت سا بیٹھایک ٹک اسے دیکھے گیا۔ لڑکی بغیر اس کی طرف توجہ دیئے مسکراتے ہوئے داخلی دروازے سے باہر نکلتی چلی گئی۔ بے یقینی کی انتہا پہ موجود عدن وہیں بیٹھا رہ گیا۔ بے یقینی ایسی تھی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کس قسم کا ردِ عمل دے۔ وہ یہاں کیوں تھا، کیا کرنے آیا تھا، کچھ دیر بعد اس کی میٹنگ تھی، اسے ڈاکیومنٹری پہ کام کرنا تھا، شام میں برانچ کا وزٹ تھا سب ذہن سے محو ہو گیا۔ کچھ یاد تھا تو یہ کہ وہ اس شہر میں تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کے سامنے تھی اور ابھی اس کے سامنے باہر نکلی تھی۔ اس کا سویا ہوا ذہن ایک دم سے جاگا۔ لاشعور سے شعور کا سفر طے ہوا۔ وہ ابھی ابھی باہر نکلی تھی۔ اسے اس کے پیچھے جانا چاہیے تھا۔ وہ پھر سے غائب ہو گئی تو۔۔۔

یہ خیال آتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ والٹ سے پیسے نکال کر ٹیبل پہ رکھتے وہ تقریباً بھاگتے ہوئے باہر کی طرف بڑھا۔ اس بار وہ اسے ڈھونڈھ لے گا۔ اس بار وہ اسے کہیں جانے نہیں دے گا۔ دماغ سے ہر خیال جاتا رہا۔ بس اس کا خیال ہر شے پہ حاوی رہا۔ ساری دنیا غائب ہو گئی۔ ایک وہی۔۔۔ بس وہی موجود رہی۔

☆☆☆☆☆

جاری ہے۔۔۔

باقی آئندہ قسط میں



پل صراط

عنیزہ زاہد



"تم مجھے ایک برا انسان سمجھتی ہونا۔ مجھے پہچاننے میں تم سے ذرا سی غلطی ہو گئی۔ میں صرف برا نہیں، ایک بدترین انسان ہوں۔" وہ گلاس میں شراب انڈیلتے ہوئے ایک ٹرانس میں کہہ رہا تھا۔ شراب گلاس سے باہر گرنے لگی تھی پر اسے تو جیسے ہوش ہی نہیں تھا۔ پھر اس نے وہ گلاس اٹھایا اور اسکی طرف دیکھا۔

وہ خوف سے اپنی جگہ پر سمٹی۔ "کیا کہہ رہی تھی تم؟ اس وقت تمہارا کوئی موڈ نہیں ہے مجھ جیسے شرابی کے منہ لگنے کا؟" وہ خود سے سوال کرتا، خود سے جواب دیتا اس کے قریب بیٹھا۔ "اور یہ کہ میں نشئی ہوں؟ آج تمہیں بھی شراب کی لذت چکھاؤں گا۔" اس نے گلاس منال کے منہ کے قریب کیا۔

☆☆☆

'کبھی تو تو بھی محبت کرے گا۔'

فاران احمد نے محبت کی تھی!

'تو بھی کسی کو ٹوٹ کر چاہے گا۔'

اس نے بھی کسی کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔

اور پھر۔۔ پھر وہ تجھے چھوڑ جائے گی۔'

اور پھر وہ اسے توڑ گئی۔

'پھر میں تیرے پاس آؤں گا۔ اور کہوں گا کہ دل پہ مت لے۔ وہ چلی گئی تو کیا ہوا، کوئی اور آجائے گی۔' اس کے جانے کے بعد کوئی نہیں آیا۔ اس نے آنے ہی نہ دیا۔

ایسین فتح



ابراہیم

"یہاں دستخط کرو غازہ ! " کاغذ غازہ کے سامنے کرتے ہوئے انہوں نے کہا تو غازہ نے ایک نظر اپنے سامنے بیٹھے اس اجنبی شخص کو دیکھا جس سے ابھی وہ چند گھنٹوں پہلے ملی تھی۔ ان چند گھنٹوں کی ملاقات نے اس شخص کو اس کا مختار بنا ڈالا تھا۔ زندگی میں پہلی بار قلم پکڑتے ہوئے غازہ کے ہاتھ بڑی طرح کانپتے تھے۔ وہ تو با آسانی قلم تمام کر شفاف کاغذ پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر بہت سارے خاکے بنا لیا کرتی تھی، کچھ دھندلے ہوتے تو کچھ میں پہلی ہی حسرت میں جان موجود ہوتی۔

"تم رشتے کھونے سے ڈرتی ہو غازہ ! " سبیکہ کا چند روز قبل کہا گیا جملہ کان کے پردے پر ابھرا تھا۔ "بچ کہا تھا تم نے میں رشتے کھونے سے ڈرتی ہوں سبیکہ ! اور یہ نیا دھور رشتہ بھی شاید میں کھونے کے لیے ہی بنا رہی ہوں۔" دل میں اس کے کہنے کا جواب دے کر اس نے کاغذ پر قلم گھسیٹا تھا۔ عجیب بات تھی وہ ایک کاروباری شادی کے لیے دلہن بنی ہوئی تھی۔

☆☆☆

"میری زندگی برباد کر کے تم یہاں سکون سے سو رہی ہو۔ شام سے مینو مجھے فون کر رہی ہے اور میں اس کا فون نہیں اٹھا رہا جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ میں اس سے بے وفائی کرنے پر بے حد شرمندہ ہوں۔ اپنی زندگی میں پہلی بار میں نے کسی کو چاہا ہے اور تم زبردستی ایک بزنس ڈیل کی طرح میرے سر پر آ گئی ہو۔" وہ بالوں میں ہاتھ چلاتا ہوا اپنے اندر کا سارا انتشار اس پر انڈیل رہا تھا۔ غازہ خاموشی سے بس اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اسے واقعی ہی اس شخص پر ترس آیا تھا جس کی محبت آباد ہونے سے پہلے ہی اس کے باپ نے اجاڑ دی تھی۔ وہ بستر سے اتر کر اس کے نزدیک آئی تھی۔

"میں بہت تلخ ہو چکی ہوں کلج ! جانتے ہو کیوں؟" اس نے اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے انتہائی آہستگی سے کہا تھا۔

"کیونکہ اس دنیا اور معاشرے کی سفاکی آپ کو تلخ بنا دیتی ہے۔ اول تو مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم کسی سے کمینڈ ہو اور بالفرض اگر مجھے معلوم بھی ہوتا تو تب بھی میں وہاں کچھ نہیں کر پاتی۔ میں یہ کاغذی تعلق تب بھی نہیں روک سکتی تھی۔ تمہاری مجرم میں نہیں ہوں کلج ارسلان ! بلکہ اپنے مجرم تم خود ہو۔ مینو کے مجرم تم ہو جو محض اپنے باپ کی لالچ کے ہاتھوں اپنی محبت پر ایک کاغذی سوتن لے آیا۔" وہ سینے پر بازو پیٹتے انتہائی تلخی سے کہہ رہی تھی جبکہ کلج بس حیرت سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

Click here

safareadab.com



دنوشہ آرزو

"جانتے ہو میرے لیے اب محبت کیا ہے۔" وہ آنسوؤں کو بمشکل روکے ہوئے تھی۔ "م جس سے (ال) مالک شروع ہوتا ہے، ج جس سے (ال) حلیم شروع ہوتا ہے، ب جس سے (ال) باری اور ت سے تمنا (وہ جو اللہ سے کی جاتی ہے) شروع ہوتی ہے۔ بس یہی ہے میرے نزدیک محبت!" وہ ضبط کی انتہا پہ تھی۔ "ایک وقت تھا تم میری تمنا تھے مگر اب صرف ایک ہی تمنا ہے میری۔۔۔ اللہ۔۔۔ بس اللہ۔۔۔" وہ رکی اور گہرا سانس لے کر بولی۔ "ایک بار بھابھی نے کہا تھا کہ ایک بار جو چڑھ جائے رنگ حب الہی تو اتر جائیں۔۔۔! ہاں وہی رنگ چڑھ گیا ہے مجھے۔" وہ زید کی خاموشی سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔۔۔ اب ایک آخری جملہ رہ گیا تھا کہنے کو۔ وہ ہمت پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کہنے لگی تھی کہ زید بولا۔ "تمنا تمہیں نہیں بھی ہے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تمہارا ہوں، تمہارا تھا، اور تمہارا ہی رہوں گا۔ شوہر کی تمنا بھی ہوتی ہے بھلا کسی کو۔" وہ مسکراتے کی کوشش کر رہا تھا۔

"شوہر کے غیر محرم ہونے میں بس ایک دستخط کی دیر ہوتی ہے۔" وہ سنگدل ہو چکی تھی۔ دوسری جانب زید کو دھچکا لگا تھا۔

☆☆☆

"مجھے سننے میں آیا ہے کہ تم کسی کو پسند کرتی ہو۔" اسے جھکا لگا کیا وہ جان گئے تھے۔ وہ ذرا بوکھلا گئی مگر جھوٹ وہ نہیں بولنا چاہتی تھی۔

"جی، مگر آپ سے کس نے کہا؟" اس نے لکھ ہی دیا۔

"وہ اہم نہیں ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ اس کا نام کیا ہے؟" وہ کچھ مزید بوکھلائی۔ اب کیا کرے؟

"میں نہیں بتا رہی۔ ابھی کچھ کنفرم نہیں ہے۔ میں ایسے تو نام نہیں بتا سکتی نا؟" اسے یہی جواب ٹھیک لگا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ یہ تاثر دے گی کہ وہ جو کوئی بھی ہے اس نے سوچنے کا وقت مانگا ہے۔ اب جھوٹ ہے تو جھوٹ سہی۔ شرم سے توجھ جائے گی نا۔

"ویسے تم نہ بھی بتاؤ تو میں جانتا ہوں وہ کون ہے۔" وہ گھبراہٹ میں پگھل رہی تھی جلتی موم کی طرح۔

اچھا اتنے پریقین ہیں تو بتائیں نام؟" اس نے ڈرتے ڈرتے ناپ کیا۔

"میں جانتا ہوں تم مجھے ہی پسند کرتی ہو، آخر۔" وہ دم بخود رہ گئی۔ آخر وہ کیسے جان سکتے تھے؟ در اگر وہ جانتے تھے تو کب سے جانتے تھے؟ وہ حیران بھی تھی اور پریشان بھی۔

"اگر تمہاری مجھ سے شادی نہ ہوئی ہوتی اور تمہیں موقع ملتا تو کیا تم حسن خان کو اپنا بیٹا مانتی؟"

رقیہ الجھ سی گئی۔ "میں سمجھی نہیں آپ کی بات کا مطلب۔"

وارث جان نے بہت سوچنے کے بعد سوال کا انداز بدل دیا۔ "تمہیں مجھ میں یا حسن خان میں سے کسی ایک کو چننا ہو تو کسے چنو گی؟"

رقیہ وارث کے اس سوال پر ناراض ہو گئی۔ "کیا ہو گیا ہے آپ کو۔۔۔ یہ کیسا عجیب سا سوال ہے۔ آپ شوہر ہیں میرے اور وہ کوئی نہیں میرا۔ بس ساتھ پڑھتا ہے اور اچھا کلاس فیلو ہے۔ اس کا آپ سے کیا مقابلہ!!!!"

وارث جان ابھی بھی الجھا ہوا تھا۔ "رقیہ میں صرف اور صرف تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر تم حسن خان کے ساتھ کو پا کر خوش رہ سکتی ہو تو۔۔۔" اس کے باقی ماندہ الفاظ اندر کہیں دب کر رہ گئے تھے۔ رقیہ جو وارث جان سے کبھی اونچی آواز میں بولنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے وارث جان کے گال پر زور دار تھپڑ مار دیا۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ کیسے اس کا ہاتھ وارث پر اٹھ گیا۔

☆☆☆

"امبر تم نے کہیں رقیہ کو دیکھا ہے۔ مجھے گیٹ سے پتا چلا کہ رقیہ آچکی ہے۔" رقیہ کی حسن کی طرف بیک تھی۔ رقیہ مسکراتے ہوئے بلیٹی اور حسن خان وہیں دل تمام کر کھڑا ہو گیا۔ "اف۔۔۔ کوئی اتنا خوبصورت کیسے ہو سکتا ہے۔" اس سے پہلے کہ حسن خان مزید کچھ اور کہتا رقیہ اس کی طرف بڑھی۔ حسن خان کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ آج وہ رقیہ کو پا لینے کے جنون سے آیا ہے۔ حسن خان کے ساتھ اس کی والدہ بھی تھیں۔ انہوں نے رقیہ کے لیے تعریفی جملے کچھ اس طرح کہے۔ "بہت خوبصورت ہو تم اور آج تو بہت زیادہ حسین لگ رہی ہو۔ جانتی ہو آج مجھے کیوں لایا ہے اپنے ساتھ؟؟" ابھی وہ مزید کچھ کہتیں کہ رقیہ نے مسکرا کر حسن کو مخاطب کیا۔

"حسن ان سے ملو میرے سہنڈ۔ سردار وارث جان۔" حسن کی آنکھیں پھٹ سی گئیں وہ بے اختیار بولا "کیا؟؟؟ کیا کہا ہے تم نے۔۔۔؟؟ کون ہے یہ؟؟۔۔۔ مطلب تمہارے ساتھ کیا رشتہ ہے ان کا؟؟؟"

Click here

safareadab.com

وراثت

فاطمہ ملک

ناولِ عہدِ رفاقت کی دیک جھلک

آپ نے کبھی کسی سے محبت کی؟ کسی ایسے سے جسے بھلانا آسان نہ ہو؟ "وہ خود نہیں جانتی تھی کہ اُسکے اندر اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی جبکہ معارج نے بے یقینی سے چہرہ پھیرا۔ اُسکا دھیان 'آپ' پر نہیں جاسکا تھا۔ لمحے بھر میں کچھ دیر پہلے کی ساری کثافت، سارے ادراک کی تاویلیں بھاپ بن کر اڑنے لگی۔ آیت نے خاموشی پر چہرہ پھیر کر اُسکو دیکھا جسکی سبز آنکھوں میں اس قدر بے یقینی تھی کہ حد نہیں۔ اُسے واقعی آیت سے ایسے سوال کی اُمید نہیں تھی۔

"محبت!" چہرہ پھیر کر اُس نے سانس لینے کی کوشش میں دھیرے سے کہا۔ مودت کا جذبہ اُسکے لیے بے حد بھاری تھا۔

"وہی جذبہ جس میں انسان کا دل کسی چہرے کو دیکھ کر دھڑکنے میں حد سے زیادہ تجاوز کر جاتا ہے؟" چہرہ پھیرے بغیر جیسے اُس سے یقین دہانی چاہی کہ آیا یہی موضوع ہے۔ آیت نے آہستگی

Safar-e-Atab

BEING THE STRING OF YOUR KITE

www.safareadab.com

عہدِ رفاقتِ مرجانِ قطب

سے اثبات میں سر ہلایا حالانکہ جانتی تھی وہ اُسکی جانب متوجہ نہیں ہے۔

"یاد نہیں! شاید کبھی، کسی دور میں لیکن اب تو دل کو دھڑکے ایک زمانہ گزر چکا ہے۔" اُسکا انداز لمحے بوجھل کر دینے والا تھا۔ ہلال نے اپنی چمک معدوم ہوتے دیکھ کر افسردگی سے ماحول پر طاری ہوتے جمود کو دیکھا اور پھر۔۔۔۔ آیتِ تطہیر کچھ کہے بغیر آہستہ قدموں سے معارج سکندر کے عین سامنے آکھڑی ہوئی۔ معارج کو سوچنے، کچھ کہنے کا موقعہ دیئے بغیر اُس نے اپنا دائیاں ہاتھ اٹھا کر اُسکے دل کے مقام پر رکھا جسکے پار موجود دل اُس چہرے کو لمحوں میں یوں قریب آتے دیکھ کر سرپٹ دوڑنے لگا تھا۔ سبز آنکھیں ششدر ہو کر پھیلیں جبکہ سنہری آنکھیں دل کی اُس رفتار پر لرزنے لگیں۔

"ابھی بھی تو دھڑکنے میں حد سے زیادہ تجاوز کر رہا ہے۔" اُس نے مدہم لہجے میں کہا جبکہ معارج سکندر چہرہ جھکائے حیرانگی سے جھکی پلکوں کو دیکھنے لگا جن میں اُسکی نگاہ کے ارتکاز پر ارتعاش

پیدا ہو رہا تھا اور اُسکے دیکھتے ہی دیکھتے سنہری آنکھیں لرز کر اٹھیں۔

"خود سے غلط بیانی نہیں کرتے، معارج!" اُسکی عین آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ کر اُس نے معارج سکندر کی زخم کھائی ہوئی، تقسیم ہوئی رُوح کھینچ لی۔ کہیں اندر زندان کے قیدی نے قفس کی آہنی سلاخوں سے سر کو ٹکا کر اپنے چہرے پر در آنے والی زخمی مگر بھرپور مسکراہٹ کو روپوش نہیں کیا۔ وہ جو کتنے سالوں سے ڈھونڈ لیئے جانے، پہچان لیئے جانے کا منتظر تھا آسودگی سے مسکرانے لگا۔ تکلیف دہ یادوں سے قفل کھلنے کا وقت قریب آگیا تھا۔

مکمل ناول فری میں پڑھنے کے لیے یہاں
کلک کریں۔

safareadab.com

سفر ادب کی جانب سے ناولوں کی پی ڈی ایف کاپی کو ہر غلطی سے ماورا بنانے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ کسی بھی طرح کی غلطی پائی جانے پر اسے محض اتفاق سمجھا جائے۔ ہماری ٹیم کے تیار شدہ پی ڈی ایف کے تمام جملہ حقوق سفر ادب کے نام محفوظ کر لیے گئے ہیں۔ کسی ادارے یا شخص کی جانب سے ہمارے کام کو اپنے آفیشل استعمال میں لانے کی کوشش کو غیر قانونی سمجھ کر سفر ادب کی جانب سے کارروائی کی جاسکتی ہے۔

- ٹیم سفر ادب